SHAHKAR Regd. No. L 2005

ALLAHABAD-1


شاہکار

اچھی تحریروں کا انتخاب

شاہکار

شمارہ — ۴۴

مجلس مشاورت

سید احتشام حسین
خواجہ احمد عباس
مہندر ناتھ
خلیل الرحمن اعظمی
مظفر شاہجہانپوری

مدیر — محمود احمد ہنر

ایک سال کے لیے — دس روپیہ
ایک رسالہ — ایک روپیہ

آفس — ممتاز باغ، لوکر گنج، الہ آباد ۲

بمبئی آفس — ڈائمنڈ لاج، سکندر پیر خاں اسٹریٹ بمبئی ۸

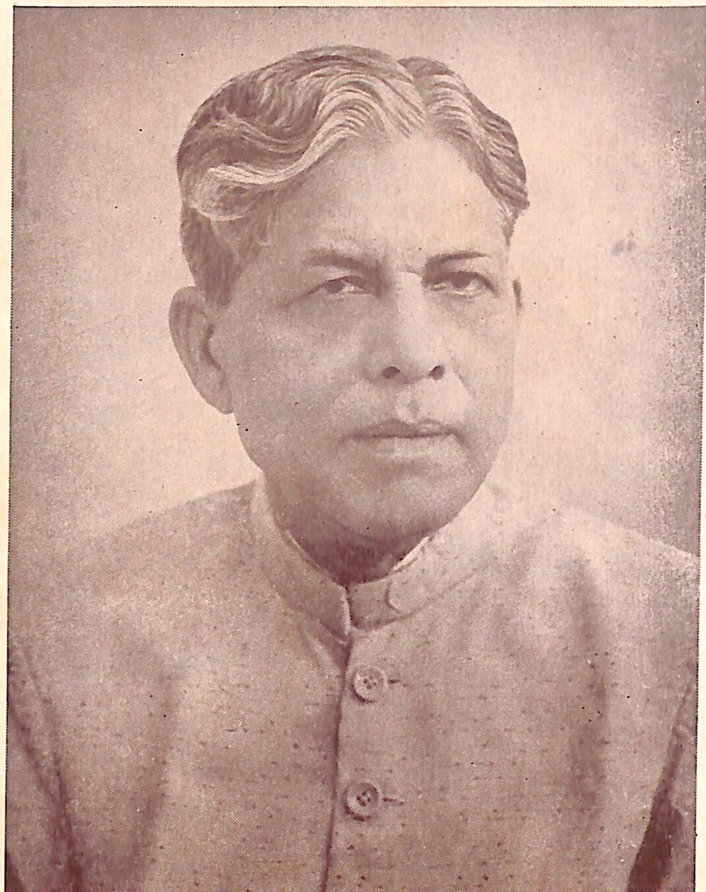
ترتیب

[مضامین]

[غزلیں]

[طنز و مزاح]

ممتاز الحق پرنٹر و پبلشر نے نیشنل آرٹ پرنٹرز الہ آباد میں چھپوا کر
دفتر "شاہکار" ممتاز باغ لوکر گنج الہ آباد سے شائع کیا



مرٹ رہا ہوں کہ زمانے کو بنا دوں اعجاز
فکرِ تخریب بھی ہے حسرتِ تعمیر بھی ہے

اعجاز

اُپیندر ناتھ اشک

موسیٰ

"موسی کاہل ہے، موسی بے وقوف ہے، موسی پھوہڑ ہے، موسی سنتی نہیں۔ موسی کے مارے جان آفت میں ہے....."

اور میں اپنی بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے موسی کے دیگر "اوصاف" کی طرف بھی اشارہ کرتا ہوں جن پر بیوی کی نظر نہیں جاتی کہ وہ سخت گرمی میں بھی اپنی کوٹھری میں سوتی ہے۔ صابن دیا جائے تو بھی کپڑے نہیں دھوتی۔ لاکھ چلاؤ، جواب نہیں دیتی اور اپنی اسی سست رفتار سے رینگے جاتی ہے۔"

"تو اُسے نکال کر کوئی قاعدے کا ملازم کیوں نہیں رکھتے" یکایک میری بات کاٹ کر بیوی طعنہ دیتی ہے۔

اور میرا تمام جوش سرد پڑ جاتا ہے، میں خاموش ہو جاتا ہوں، بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کرتا ہوں یا چپ چاپ وہاں سے کھسک جاتا ہوں۔

موسی اوسط قد اور دُہرے بدن کی کالی کلوٹی اور بدشکل عورت ہے، اس کے دانت تمبا کو کھاتے کھاتے گھس گئے ہیں اور اتنی سست ہے کہ پانچ منٹ کا کام آدھ گھنٹے میں سرانجام دیتی ہے۔ میں ایسی ملازمہ کبھی نہ رکھتا لیکن تقسیم ملک کے بعد جب میں الہ آباد آیا تو جس طرح مہنگے کرایہ کا مکان لینے کی سکت نہ تھی اسی طرح مہنگا ملازم رکھنے کا بھی حوصلہ نہ تھا۔ تین ماہ کی دوڑ دھوپ کے بعد خسرو باغ کے قریب ایک عقبی حصے میں ایک چھوٹی سی کاٹج ملی۔ موسی اسی کے برابر شاگرد پیشہ میں رہتی تھی۔ بے کار تھی۔ چنانچہ سات روپے ماہوار میں کام کرنے کو تیار ہو گئی۔ اس کا بھانجہ جو بنگلے کے مالک کا باورچی تھا، اُسے موسی کہہ کر پکارتا تھا۔ اس لئے وہ ہماری بھی موسی ہو گئی۔

ان آٹھ برسوں میں اگرچہ مکان تو آہستہ آہستہ بڑھ کر گیارہ کمروں کا ہوگیا مگر باورچی خانہ نہیں بدلا اور موسی بدستور موجود ہے۔ اس کی تنخواہ تگنی ہوگئی ہے مگر اس کے کام کرنے کی رفتار اور بھی سست ہوگئی ہے۔ کئی بار اس کی مدد کے لئے ملازمہ رکھی گئی۔ لیکن وہ کسی دوسرے کو باورچی خانے کے قریب نہیں پھٹکنے دیتی اور خود ٹھیک سے کام نہیں کرتی۔

ہماری چیخ، پکار اور جھلاہٹ کا اس پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ اپنی رفتار وہ ذرا بھی نہیں بدلتی اور اپنی اسی خاموشی اور سست روی سے کام کئے جاتی ہے۔ کبھی زبان کھولتی بھی ہے تو ہمارے چلانے یا شور مچانے کا اس کے جواب میں کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا —— نہ عام ملازموں کی طرح آواز میں جھلاہٹ نہ غصہ، نہ چڑچڑاپن اور نہ گستاخی!

"موسی یہ آج تو نے پھر اچار نہیں رکھا!" میں لنچ کے وقت چلاتا ہوں۔ "تجھ سے بیس بار کہا ہے کہ کھانے کے لئے اس وقت بلایا کر جب میز پر سب چیزیں رکھ دی ہوں۔ اب جتنے میں تو اچار لائے گی، میں آدھا کھانا کھا چکوں گا۔"

"بھلا ئے گئے بھیتے۔" اور وہ ڈولی سے اچار کی پلیٹ نکالتی ہے لیکن عموماً پلیٹ میں اچار ختم ہوتا ہے اور وہ اسٹور سے لانے جاتی ہے اور جب آدھ گھنٹے کے بعد اچار لے کر واپس آتی ہے تو میں اُٹھ چکا ہوتا ہوں۔

"..... موسی، یہ تو نے پھر پلیٹیں گیلی ہی میز پر رکھدیں —— تجھ سے بیس بار کہا ہے، جھاڑن لا لا کر دیئے مگر تو کبھی نہیں پونچھتی۔" میری بیوی کہتی ہے۔

"پونچھتی تو ہوں بہو!"

بہو کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔ "یہ پونچھی ہے، دیکھ! یہ پونچھی ہے؟" اور وہ گیلی پلیٹ اس کے سامنے کرتی ہے۔

موسی خاموشی سے پلیٹ لے لیتی ہے۔ "اری ہم کے دئی دیں تو دوسر لئی لیں۔" یہ کہتے ہوئے

وہ دوسری پلیٹ بہو کو دے دیتی ہے۔

"..... موسی، تین چار دن ہوئے میں پھل لایا تھا۔ ایک دن کھائے پھر تو نے میز پہ نہیں رکھے۔"

"ارے تو بھئے، کا ہم کھائے گئے؟"

"تو نکال!"

لیکن پھل سڑ چکے ہوتے ہیں اور میں چلاتا ہوں کہ ہمیں دینا بھول گئی تھی تو خود ہی کھا لیتی، اب یہ کس کام آئیں گے؟"

وہ کچھ نہیں کہتی۔ جا کر انھیں کوڑے کی ٹوکری میں ڈال آتی ہے۔

"..... موسی!..... موسی!! بیوی بہو اچانک سالن نکالتے نکالتے اٹھ کر چلاتی ہے۔

موسی کا کوئی جواب نہیں آتا۔

"..... موسی!..... موسی!!"

کئی بار چلانے پر موسی کچن سے حسب معمول جھومتی جھامتی آہستہ آہستہ آتی ہے۔

"کانوں میں کیا روئی ڈال کر بیٹھی ہے۔ اتنی آوازیں دیں، جواب کیوں نہیں دیتی؟"

"ارے آوت تو رہے۔"

"آوت تو رہے۔" بیوی آنکھیں نکالتی اور منہ بناتی ہے۔ "ہونٹ گیا سی رکھے ہیں۔ کہا نہیں جاتا کہ آ رہے ہیں۔"

اس سب کا وہ کچھ جواب نہیں دیتی۔ تمباکو کے لعاب کو منہ میں بھولتے ہوئے ٹھوڑی کو قدرے آگے بڑھا کر، آہستہ سے محض اتنا پوچھتی ہے۔ "کا کہت ہو؟"

"کہتے ہیں تیرا سر۔" بیوی جھلاتی ہے "یہ آج پھر نمک نہیں ڈالا ترکاری میں، کتنی بار کہا ہے کہ الگ کٹوری میں نکال کر ذرا سی چکھ لیا کر۔"

"ارے ہو ڈالے تو ہے"

"ڈالے تو ہے۔ تو کیا ہم نے اڑا دیا؟ ذرا کھا کر دیکھو، رتی بھر بھی ہے نمک اس میں؟"
ہوسی پر اس ڈانٹ کا ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ سر کو عجیب مجہوں انداز سے حرکت دیتی ہوئی کہتی ہے "ڈالے تو ہے۔ کمتی ہوئے گو اہوئی"

اب میں چیختا ہوں۔ "کمتی کیا۔ ذرا بھی نہیں۔ ایک دم پھیکی ہے"
"تو بھلا رے گئے ہوئی بھیئے"
اور وہ چپ چاپ سائڈ بورڈ سے نمک دانی اٹھا کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے۔

یہ سب روزانہ کا معمول ہے۔ اچار رکھا ہو، پلیٹیں صاف ہوں، پھل درست حالت میں ہوں، نمک کم نہ ہو، تو صراحی میں پانی نہ ہوگا، روٹی پیپڑی سی سوکھی ہوگی، رائتہ بنا کر رکھا ہوگا۔ مگر دینا بھول گئی ہوگی۔ دودھ نہ جمائے جانے کے باعث پھٹ گیا ہوگا یا کچھ اور گڑبڑ ہوگی۔ عموماً ایک آدھ بار چلا کر یا چلانا بے کار سمجھ کر دل ہی دل میں کھسیا کر ہم خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے کام میں لگ جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک اٹھتا ہے اور دماغ توازن کھو دیتا ہے۔ کوئی فائدہ نہ سمجھتے ہوئے بھی ہم چلاتے جاتے ہیں۔

دفتر گھر ہی میں ہے۔ بیوی نشر و اشاعت کا کام سنبھالتی ہے مگر کئی بار مجھے اس کے ساتھ جانا پڑتا ہے۔ وقت کی پابندی نہیں رہتی۔ کوئی کتاب چھپ رہی ہے یا چھپنے والی ہے۔ ہم پریس میں کام کرانے یا کاغذ کا انتظام کرنے باہر گئے ہوتے ہیں۔ آتے آتے ڈیڑھ دو بج جاتے ہیں۔ بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگتے ہیں۔ بیماری کے بعد میں تو کچھ ایسا کمزور ہو گیا ہوں کہ وقت پر کھانا نہ کھاؤں اور بھوک لگ آئے تو نہایت کمزوری محسوس ہوتی ہے اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ وہ دن گئے جب یار دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں صبح سے شام ہو جاتی تھی اور کھانے پینے کا ہوش نہ رہتا تھا یا کوئی دلچسپ ناول ساری بھوک پیاس

کھلا دیتا تھا ———— رکشا میں گھر واپس ہوتے ہوئے کھانے کا کمرہ اور میز پر لگی پلیٹوں اور سالنوں کی خوشبو کے تصور سے دل و دماغ بس جاتے ہیں اور بھوک تیز تر ہو جاتی ہے

رکشا سے اُترتے ہی چلاتا ہوں۔ "موسی کھانا رکھو۔"

"رکھت ہیں بھیئے"

کھانا رکھا جاتا ہے۔ ہم کھانے بیٹھتے ہیں لیکن ابھی نصف بھی ختم نہیں کرتے کہ معلوم ہوتا ہے روٹیاں ختم ہو گئی ہیں

"موسی!" میں یا بیوی چلاتی ہے۔ "روٹیاں نہیں پکائیں۔"

"گرم گرم لائے رہے ہیں" وہ کچن ہی سے چلاتی ہے۔

اور یکایک کھانے کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ موسی کے "گرم گرم لانے" کے معنی ہم دونوں بخوبی سمجھتے ہیں۔

بیوی چلاتی ہے "جب دو بج گئے تھے تو اس نے پورا کھانا کیوں نہ تیار کر رکھا۔"

اور میں جھنجلاتا ہوں کہ وہ بار بار کیوں ایک ہی بات کہلواتی ہے۔ کیوں بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ گرمی میں اندر سوتی ہے، اس کے بھیجے میں عقل بھی کہاں رہ سکتی ہے۔

اور پندرہ بیس منٹ تک چلا کر اور انتظار کر کے تھک ہار کر ہم کھانا درمیان ہی میں چھوڑ کر کچن میں جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ موسی ایک ہاتھ سے آٹا گوندھ رہی ہے اور دوسرے سے انگیٹھی دھونک رہی ہے۔

"تو نے روٹی نہیں پکائی تھی تو آٹا کیوں نہیں گوندھ رکھا تھا؟" بیوی چلاتی ہے۔

"اب آگ جلانے بیٹھی ہے" میں گرجتا ہوں "ڈھائی بج گئے ہیں۔ گرم روٹیاں کھلانی تھیں تو انگیٹھی تو گرم رکھی ہوتی۔"

لیکن موسی ہمارے چیخنے اور گرجنے کا کوئی جواب نہیں دیتی۔

"ہوئی جات ہے، ہوئی جات ہے" مونہہ سے ہمیں تسلی دیتے ہوئے وہ بدستور ایک ہاتھ

ہاتھ سے آٹا گوندھتی ہوئی دوسرے ہاتھ سے پنکھا ہلائے جاتی ہے۔

ہم جھلائے ہوئے واپس کھانے کی میز پر آ بیٹھتے ہیں۔ موسی کے خلاف شکایتوں کے دفتر کھل جاتے ہیں اور نان آخر بیوی کی اس بات پر ٹوٹتی ہے۔ "کوئی قاعدے کا نوکر رکھئے۔ اس کم بخت کے مارے تو جان عذاب میں ہے ——"

اور میری ساری جھلاہٹ یکایک ختم ہو جاتی ہے۔ غصہ پی کر میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ بیوی طعنے دیتی ہے کہ میں موسی سے دبتا ہوں، نیا باورچی رکھنا نہیں چاہتا۔ میں خاموش رہتا ہوں، اور خاموشی آپ جانتے ہیں نیم رضا کے مصداق ہوتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیڈ ٹی کے اوپر ناشتہ بھی ہو چکا ہوتا ہے اور موسی دوپہر کے کھانے کی سبیل میں لگی ہوتی ہے کہ کوئی دوست ملنے آ جاتا ہے اور میں اخلاقاً پوچھ بیٹھتا ہوں۔ "بھائی چائے پیو گے؟"

"کیا مضائقہ ہے؟" دوست جواب دیتا ہے۔

اور میں وہیں سے چلا کر کہتا ہوں: "موسی! دو پیالے چائے لاؤ"

اور اس وقت جب باتوں کا سلسلہ میانہ روی سے چل رہا ہوتا ہے اور صرف دوست کا بلکہ میرا دھیان بھی کچن کی طرف لگا ہوتا ہے کہ چائے آ جائے۔ ایک ایک کپ پی لیا جائے تو بات چیت یا بحث میں کچھ گرمی آئے تو موسی ٹرے میں چائے لئے اپنی اسی مخصوص سست رفتار سے آتی ہے۔ میں اس کے ہاتھ سے ٹرے لے لیتا ہوں۔ مسلسل باتیں کرتے ہوئے، پہلے ذرا سی چائے ڈال کر پیالیاں گرم کرتا ہوں۔ پھر چائے کا پانی پیالی میں ڈال کر اپنی پھر دوست کی پیالی میں اس سے پوچھ کر ایک یا دو چمچے شکر ڈالتا ہوں لیکن جب دودھ دانی اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ ندارد ہے۔

"ارے موسی!" چڑ کر میں چلاتا ہوں۔

موسی وہی میلی دھوتی پہنے، نچلے ہونٹ میں تمباکو دبائے، نہایت اطمینان سے کسی قسم کی عجلت

کئے بغیر آتی ہے اور تمبا کو سے نچلا ہونٹ بھرا ہونے کے باعث ٹھوڑی ذرا اٹھا کر پوچھتی ہے: "کیا بات ہے؟"

"دودھ نہیں لائی؟" میں چلاتا ہوں۔

"ارے دودھ کہاں ہے بھیجے!" موتہہ ذرا اٹھا کر دونوں ہاتھ آگے پھیلاتے ہوئے وہ کہتی ہے۔ میں ایک لمحہ اس کو دیکھتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ اس کا اور اپنا سر نوچ لوں۔ کتنی بار سمجھایا ہے مگر اس بے وقوف کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مہمان بیٹھا ہو تو ایسی بات نہیں کہنی چاہیئے لیکن کسی طرح غصّے کو پی کر، ضبط سے کام لے کر پوچھتا ہوں۔ "نہیں تھا دودھ تو چائے کیوں بنائی؟ کیا دودھ کے بغیر پہلے کبھی چائے پی ہے، جواب پئیں گے۔ چائے بنانے سے پہلے کیوں نہیں آگیا دودھ؟"

"کیسے منگائت بھیجے؟"

اب ضبط کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ غصّے سے چلا اٹھتا ہوں۔ "کیا دفتر میں سب لوگ مر گئے ہیں؟ چپراسی کہاں ہے؟"

لیکن موسی اس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ چپ چاپ تمباکو کا رس پیے جاتی ہے۔

"پشتی کہاں ہے؟" میں اپنے سالے کے بارے میں پوچھتا ہوں جو میری بیوی کے ساتھ سپلٹنگ کا کام دیکھتا ہے۔

موسی جواب نہیں دیتی، چپ چاپ دیکھے جاتی ہے۔

"اور کوئی نہیں تھا تو تو نے مجھ سے کیوں نہ کہا میں خود جا کر بازار سے دودھ لا دیتا۔ دودھ نہیں تھا کیوں بنائی چائے؟"

دوست لاکھ کہتا ہے کہ یار میں چائے پی کر چلا تھا۔ تم نے پوچھا تو میں نے یونہی ہاں کر دی۔ اب ہٹاؤ اس قصے کو۔ لیکن میں برابر چلائے جاتا ہوں۔ غصہ اس بات کا نہیں کہ چائے کیوں بنی بلکہ اس بات کا ہے کہ جب گھر میں دودھ نہیں تھا تو کیوں بنی اور اگر بن گئی تھی تو اور دودھ کے نہ ہونے کا علم بعد میں ہوا تھا تو ہمارے سامنے کیوں آئی اور مہمان کے سامنے اس نے کیوں کہا کہ دودھ نہیں ہے ... اور میں چائے کی ٹرے دھکیل دیتا ہوں اور دندناتا

ہو ا باہر جاتا ہوں اور اتنی زور زور سے چلّاتا ہوں کہ چپراسی اور لسّی اور میری بیوی ایک ساتھ دفتر سے باہر نکل آتے ہیں اور سب باتیں سُن کر میری بیوی چپراسی کو دودھ لانے کے لئے بھیجدیتی ہے اور تاکید کرتی ہے کہ سائیکل پر جائے اور پلک جھپکتے لے آئے۔

چپراسی کو تاکید کر کے بیوی پھر اپنے کام میں لگ جاتی ہے اور واپس آکر میں پھر باتوں کا سلسلہ جوڑنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن تنے ہوئے اعصاب۔ باتیں چل نہیں پاتیں۔ بار بار اس احمق ملازم پر غصہ آجاتا ہے۔

دوست اکتا کر کہتا ہے۔ "اچھا یار! میں چلتا ہوں۔ پھر آؤں گا۔"

"نہیں نہیں، بیٹھو۔ چائے پی کر جانا۔" میں اصرار کرتا ہوں۔

دوست مجبور ہو کر پھر بیٹھ جاتا ہے۔ میں پھر ادھر اُدھر کی باتیں چلانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن بات چل نہیں پاتی۔

اچانک چپراسی سیدھا یہیں کمرے میں دودھ کا لوٹا لے آتا ہے۔

"میں دودھ کیا کروں گا؟ ادھر کچن میں لے جا اور موسی سے کہہ کر پانی گرم کر کے تازہ چائے بنائے اور دودھ بھی گرم کر لے۔"

دوست پھر ایک بار زور دینا چاہتا ہے ــــــ "ہٹاؤ یار اب چائے۔" لیکن میں ہاتھ بڑھا کر اُسے وہیں روک دیتا ہوں۔

"موسی تو وہاں نہیں ہے۔" چپراسی آکر اطلاع دیتا ہے۔

"نہیں ہے تو دیکھ کہاں ہے؟ تمباکو کھانے گئی ہوگی۔ اس کی بہن سے پوچھو۔"

اور برآمدے میں نکل کر میں ادھر اُدھر ٹہلتا ہوں اور دوست پچھتاتا ہے کہ اُس نے چائے پینے کے لئے کیوں حامی بھری اور مفت کی بوریت مول لی۔

اس وقت چپراسی آکر بتاتا ہے۔ "موسی باہر گئی ہے۔"

"باہر گئی ہے! کیوں باہر گئی ہے؟" میں چلّاتا ہوں۔ "اُسے معلوم نہیں تھا کہ میں نے تجھے دودھ لانے کے لئے بھیجا ہے؟"

"اب ہم کا بتائی"؛ چپراسی بے بسی سے کہتا ہے۔

میں لہو کے گھونٹ بھر رہا ہوتا ہوں۔ بیوی دفتر کا کام چھوڑ کر خود کچن میں جا کر پانی چڑھاتی ہے کہ موسی نہایت اطمینان سے کسی قسم کی عجلت کے بغیر، اس سست رفتار سے جھومتی جھامتی باہر سے آتی دکھائی دیتی ہے۔

"موسی تو کدھر چلی گئی تھی؟ تجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے دوست آئے ہوئے ہیں اور میں نے چپراسی کو دودھ کے لئے بھیجا ہے؟"

"ارے بھیا باہر گئے رہے"

اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں نکالے راس کماری سی ٹھوڑی آگے بڑھائے تمباکو بھرے دانت دکھاتی ہوئی دونوں ہاتھ بڑھا دیتی ہے

باہر کا مطلب سمجھ جاتا ہوں، مگر میرا غصہ کم نہیں ہوتا

"باہر گئی تھی تو جاتے جاتے پانی چڑھا جاتی"؛ میں چلاتا ہوں۔

موسی ذرا بھی نہیں گھبراتی۔ "چڑھائے دیت ہیں..... چڑھائے دیت ہیں" کہتی ہوئی اسی سست چال سے وہ کچن کی طرف چل دیتی ہے۔

شام کو میں بیوی سے شکایت کرتا ہوں تو وہ الٹا مجھی پر برسنے لگتی ہے۔ "میں کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ قاعدے کا نوکر رکھئے اس کم بخت کے مارے تو جان آفت میں ہے۔ دودھ ختم ہو گیا تھا یا گوالا کم دے گیا تھا تو مجھ سے آکر کہتی میں منگا دیتی"

اور بیوی موسی کو بلا کر ڈانٹتی ہے

اب سارے دن چائے بناوت بناوت جان آپھت میں آئے جات ہے"؛ وہ احتجاج کرتی ہے۔

"سارے دن چائے بنانے سے، دودھ نہ ہونے پر مہمان کے سامنے بے عزتی کرنے کا کیا تعلق ہے"؛ میں چلاتا ہوں۔

لیکن یہ بات موسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ رونے لگتی ہے کہ اسے چھٹی دے دی جائے، اتنا

کام کرنے پر بھی اسے ڈانٹ پڑتی ہے اور بیوی کہتی ہے۔ ہاں، آپ دوسرا نوکر تلاش کیجئے۔"

لیکن میں دب جاتا ہوں۔ میرا غصہ ایک دم سرد پڑ جاتا ہے اور میں پینترا بدل کر موسی کو سمجھانے لگتا ہوں کہ چھٹی دینے دلانے کی بات نہیں، اسے خود خیال ہونا چاہیے۔ مہمان کے سامنے ایسی بات کہنے سے گھر کی کیسی بے عزتی ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ......

ایسے موقعوں پر میرے سامنے ہمیشہ اپنے ایک دوست کی صورت آجاتی ہے۔ وہ ایک پنجابی نوجوان ہیں۔ چار ایک سال قبل کشمیر میں تعینات ہوئے ہیں۔ میں دو سال سے کشمیر جا رہا ہوں۔ اور ان کے گھر کی ایک ایک بات سے واقف ہوں۔ وہ ابھی غیر شادی شدہ ہیں گھر میں صرف ماں اور ایک پنجابی چھوکرا ہے۔ ماں کشمیری زبان بالکل نہیں سمجھتیں اور وہ چھوکرا ہے کہ سینما کا فرسٹ کلاس شوقین ہے ہفتہ میں دو تین بار پکچر نہ دیکھے تو اسے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ انھوں نے چائے پر کچھ دوست بلا رکھے ہوتے ہیں مگر وہ چھوکرا اسٹینی شو دیکھنے چلا جاتا ہے۔ اس کے آتے ہی ماں بیٹے پر برس پڑتے ہیں لیکن وہ معافی مانگنے یا بقیہ کام نمٹانے کے بجائے باہر جاکر پنواڑی کی دوکان پر جاکر بیٹھ جاتا ہے۔ آدھ ایک گھنٹے ماں بیٹے جھلاتے رہتے ہیں۔ ماں کہتی ہے۔" جن کے ملازم نہیں ہوتے۔ ان کا کیا کام نہیں چلتا، اور بیٹا نہایت فلسفیانہ انداز میں گھر کے سب کام خود کرنے کے فوائد پر اپنے بیش قیمت خیالات کا اظہار کرتا ہے اور دونوں ماں بیٹے پروگرام بناتے ہیں کہ ملازم کو ہٹا کر وہ کس طرح گھر کے تمام کام خود انجام دیں گے۔ بیٹا کس طرح ایک دن قبل ہی شام کو وہ ساری چیزیں لاکر رکھدیا کرے گا، جن کی دوسرے دن ضرورت ہوگی، اور ماں کس طرح ملازم کی مدد کے بغیر کام چلائے گی...... لیکن میں نے ہمیشہ دیکھا کہ جب رات کا کھانا پکتا تو ماں ملازم چھوکرے کے لئے بڑے پیار سے کھانا پکاتی اور بیٹے صاحب اسے منا کر لاتے ـــــــ

میری حالت اپنے اس پنجابی دوست سے مختلف نہیں۔ یہ بات نہیں کہ میری بیوی کھانا نہیں پکا سکتی۔ وہ اتنے اچھے کھانے پکاتی تھی کہ ایک بار شادی کے بعد میں نے سوچا تھا کہ اسے دوسرا کوئی کام نہ کرنے دوں گا۔ لیکن جو عورت ہیڈ مسٹریس کی حیثیت سے اسکول کا جونیر کمانڈر کی حیثیت سے فوجی محکمہ کا ناشر کی حیثیت سے ایک اشاعتی ادارہ کا تمام کام اپنے سر لے سکنے کی صلاحیت

رکھتی ہو اُسے کچن کی چہار دیواری میں بند رکھنا میرے نزدیک ناانصافی ہے۔

مجھے خود بھی کوئی کام کرنے میں عار نہیں ہے۔ برسوں گھر میں جھاڑو دینے اور کپڑے دھونے کے علاوہ میں نے برتن صاف کئے ہیں اور کھانا پکایا ہے۔ لیکن ایسا وقت بھی آجاتا ہے۔ جب انسان چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کرسکتا اور ایسی حالت میں موسی جیسی ملازمہ بہت اہمیت حاصل کرلیتی ہے۔

یہ بھی نہیں کہ شہر میں ملازموں کا قحط پڑ گیا ہے اور میں نے ملازم بدلنے کی کوشش نہ کی ہو۔ تین بار ایسا کر کے دیکھ چکا ہوں۔

ایک بار موسی پیٹ درد کا بہانہ کر کے کسی رشتہ داروں کے یہاں چلی گئی۔ میری بیوی بیمار تھی مجبوراً ایک دوسرا ملازم ڈھونڈ لایا چست اور چاق و چوبند۔ دن بھر اس نے اس تیزی اور صفائی سے کام کیا کہ میں اور میری بیوی عش عش کر اُٹھے اور ہمیں موسی سے عیب کئی گنا بڑے ہوکر نظر آنے لگے اور پہلی بار معلوم ہوا کہ ہم کس جاہل کے ساتھ دن کاٹتے رہے ہیں لیکن دوسری صبح اُٹھے تو ملازم صاحب غائب۔ باورچی خانے میں جانے پر معلوم ہوا کہ ترکاری کاٹتے کاٹتے کہیں گئے ہیں۔ جب دن کے بارہ بج گئے اور وہ تشریف نہ لائے تو فکر ہوئی۔ کھوج خبر لی کہ کہیں کچھ لے تو نہیں گئے تو معلوم ہوا کہ میری کی دراز سے پارکر قلم، ایک گھڑی اور بٹوا غائب ہے۔

دوسری بار جب موسی بیمار ہوئی تو میں ایک خانسامہ کو لے آیا جس کے پاس کئی انگریزی کے سرٹیفکیٹ تھے۔ شام کی چائے ہم پی چکے تھے کہ یکایک چھ بجے کے قریب ایک دوست آگئے اور میں نے خانساماں سے کہا کہ دو پیالیاں چائے ٹرے میں بھجوا دے۔ جب کافی دیر تک چائے نہ آئی تو میں خود کچن میں گیا۔

”صاب چائے کے وقت ہم چائے دے گا“ خانساماں صاحب فرمانے لگے۔ ”سارا دن ہم چائے نہیں دے گا۔“ اور میں نے ان کے سرٹیفکٹوں میں ایک مزید سرٹیفکیٹ کا اضافہ کر کے انھیں دوسرے ہی دن سلام کیا۔

تیسری بار موسی نے نوٹس دیا کہ وہ دو دن کے لئے ایک شادی میں جائے گی کیونکہ اس کے

دو اور دس دنوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے میں نے ایمپلائمنٹ ایکسچینج فون کیا کہ مجھے فوراً ایک کک چاہئے۔ دوپہر ہی کو شکل و صورت سے سائیس نظر آنے والا ایک دبلا پتلا اوسط قد کا آدمی دفتر کی چٹ لے کر آ پہنچا۔ اس کی ٹانگیں پرکار کی طرح قدرے باہر کی طرف نکلی ہوئی تھیں۔ اپنے قد و قامت سے کہیں بڑا کھلا گرم کوٹ اور پچکی سی گول ٹوپی اس نے پہن رکھی تھی۔ موسی دوپہر کا کھانا تیار کر کے چلی گئی تھی میں نے زیادہ پوچھ گچھ نہ کرتے اسے لے کر کچن دکھایا اور سمجھایا کہ کس طرح اس گھر کا کام چلتا ہے۔

"بس بابو جی، دو ایک دن ہم دیکھ لیں..... پھر آپ کو کوئی شکایت نہ ہوگی"

برتن پڑے تھے اس نے صاف کر دیئے۔ روٹی کافی بچی پڑی تھی، اس نے خوب ڈٹ کر اس پر ہاتھ صاف کیا۔ میں دفتر چلا گیا۔ میں شام کو آیا تو دیکھتا ہوں کہ کچن میں مصروف رہنے کی بجائے باورچی صاحب کچن کے سامنے کی خالی جگہ میں کیاریاں بنا رہے ہیں۔

"ارے بھائی، تم یہ سب کیا کر رہے ہو؟" میں نے قدرے جھلا کر کہا "چائے کا وقت ہو گیا ہے کچھ چائے وائے بناؤ"

"سرکار ایک بار بہو جی بنا کر دکھادیں تو ہم سب بنا دیا کریں گے کوئی زیادہ پتی پیتا ہے، کوئی کم"

"تو یہ تم نے پہلے کیوں نہ کہا۔ یہ سب تم کیا کر رہے ہو؟"

"سرکار، خالی جگہ ہے۔ میں نے سوچا کیاریاں بنا دوں" فلاگ "یہاں بڑی بہار دے گا۔ ادھر ڈیلیا" کی قطار لگ جائے گی، ادھر سوئٹ سلطانہ، مسکرائے گی اور اس جگہ....."

"تو کیا تم مالی ہو؟"

"سرکار میں ٹائل (ٹائلز) صاحب کے یہاں سائیس تھا۔ پر صاحب لوگ سب ولایت چلے گئے، جب سے میں مالی کا کام کرنے لگا۔ صاب، آپ ایک گھوڑا گاڑی رکھئے۔ پھر ہمارا کام دیکھئے۔"

"تو کیا تم کک نہیں ہو؟"

"بہو جی سکھادیں گی تو وہ کام بھی سیکھ لوں گا"

مختصر یہ کہ پندرہ دن تک روٹیاں پکانے کے بجائے کک صاحب کیاریاں بنا کر ان میں پھول لگاتے رہے۔ اتنا ہی غنیمت ہے کہ کسی نہ کسی طرح برتن صاف کر دیتے تھے۔ ہمارا تو کیا پکاتے ان کا اپنا

کھانا بھی میری بیوی کو پکانا پڑا۔ آخر یہ وعدہ کر کے میں نے ان سے نجات حاصل کی کہ جوں ہی میں گھوڑا گاڑی رکھوں گا، انھیں ضرور یاد کروں گا۔

ایسے اوقات میں موسی کے سوا ہمیں کہیں پناہ نہیں ملتی۔ وہ سست اور جاہل ہے تو کیا ہوا۔ پرلے سرے کی ایماندار، حلیم اور خاموش بھی تو ہے۔ ایسے ملازموں کا ملنا، جن میں موسی کی خوبیاں تو ہوں لیکن عیب نہ ہوں میرے خیال میں اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ہم جیسے کمزور اعصاب والوں کو جتنی جلد غصہ آتا ہے اتنی جلد اتر بھی جاتا ہے۔ لیکن مالک کے غصہ پر اگر ملازم کو بھی غصہ آنے لگے تو پھر مالک کا اللہ ہی مالک ہے۔ استاد بھی گرم اور شاگرد بھی گرم تو بات کیوں کر بنے؟ موسی کا یہ عیب کہ لاکھ بکے جاؤ، اس کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس کے کان پہ جوں رینگنے لگتی تو یہ آٹھ برس کیوں کر گزرتے۔ اس کا تصور بھی تکلیف دہ ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ موسی ٹھیک سے کام کرنے لگے لیکن اس کی جگہ دوسرا ملازم رکھنے کا تصور بھی نہیں کرتا۔ اسے بھی جیسے اس بات کا یقین ہے کہ لوگ دس ملازم رکھیں، میرے بغیر ان کا کام نہیں چل سکتا۔

چونکہ دفتر گھر ہی پر ہے، اس لئے ذاتی اور کاروباری ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ بار بار چائے بنتی ہے۔ موسی نے آج تک کبھی (جب تک کہ خود ہم نے ہی اسے ایسا کرنے سے منع نہ کر دیا ہو) چائے بنانے سے انکار نہیں کیا، یہ اور بات ہے کہ اسے پانچ منٹ میں چائے لانے کو کہئے تو وہ آدھ گھنٹے میں لاتی ہے۔ کئی بار (خصوصاً سردیوں میں) ایسا بھی ہوا ہے کہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے جب موسی کچن بند کر کے جانے والی ہوتی ہے۔ میری بیوی کافی پینے کی خواہش ظاہر کرتی ہے اور موسی میری طرف دیکھ کر ذرا ہنستے ہوئے آنکھیں دکھا کر کہتی ہے۔ "دیکھیں بھیّے اب بہو کا بھی مانگت ہیں۔" اور میں کہتا ہوں۔ "یہ کوئی وقت ہے کافی کا۔ اب جاؤ سو رہو۔ صبح تمھیں جلدی اُٹھنا ہوگا۔ بچوں کے ناشتے کے لئے۔" اور میری بات سن کر میری بیوی کہتی ہے۔ "اچھا ٹھیک ہے موسی، تم جاؤ۔ اب نہیں پیتے۔"

موسی کچھ نہیں کہتی، چلی جاتی ہے اور جب آدھ ایک گھنٹے بعد میں سونے کی تیاری کر رہا ہوتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ موسی کافی لئے ہوئے چلی آ رہی ہے

میں جھلاتا ہوں۔ "موسی تم بہو کی عادت بگاڑتی ہو۔ تم سے کتنی بار کہا ہے کہ بہو کو بار بار کافی نہ دیا کرو، یہ نہ مانیں تو مجھے بتایا کرو۔"

"ارے بھیّے۔ اب ای کام کرت کرت تھک جات ہیں۔" وہ اپنی ڈھیلی ڈھالی آواز میں کہتی ہے۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسی شفقت اور محبت ہوتی ہے کہ دل بھر آتا ہے۔

موسی چلی جاتی ہے، تو بیوی موسی کی ان خوبیوں کا تذکرہ کرتی ہے جو اس کی برائیوں کے نیچے دبی رہتی ہیں۔ لیکن جو عام ملازموں میں قطعی مفقود ہوتی ہیں اور سوچتی ہے کہ موسی نہ رہے گی تو ہمارا کیا حال ہوگا اور میں کہتا ہوں "وہ تو ہیرا ہے ہیرا۔" اور ہم دونوں سوچتے ہیں کہ موسی بوڑھی ہوگئی ہے۔ اس سے تیزی سے کام ہو ہی کیسے سکتا ہے۔ اور ہم طے کرتے ہیں کہ خواہ ہم دوسرے ملازم رکھ لیں لیکن موسی کو کبھی علیحدہ نہ کریں گے۔

موسی میرے چھوٹے بچے سے بہت پیار کرتی ہے، وہ اسے تنگ کرتا ہے، پریشان کرتا ہے۔ لیکن اگر مذاق میں بھی موسی کو نکالنے کی بات ہو تو (اگرچہ اب وہ کافی بڑا ہوگیا ہے پھر بھی) اُس کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ میرے بچے ملازموں سے کسی قسم کی بدتمیزی سے پیش آئیں۔ میں خود بھی علالت یا پریشانی میں ہی کبھی چلاتا یا جھڑکتا ہوں مگر بچے تو میری اس مجبوری کو نہیں دیکھتے میری تقلید میں مجھ سے ایک قدم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایک بار میرے چھوٹے لڑکے نے موسی کو بری طرح ڈانٹ دیا اور موسی نے ہنستے ہوئے کہا "دیکھیں بھیّے گڈے بھیا ہمیں ڈانٹت ہیں۔"

جانے میں بہت مصروف تھا، تھکا ہوا تھا یا علیل تھا۔ مجھ پر خون سوار ہوگیا۔ میں نے اسے آواز دی اور بڑھ کر ایک زور کا طمانچہ اس کے مونہہ پر جما دیا۔ وہ روتا ہوا موسی کی گود میں جا چھپا۔ میں نے لاکھ جتن کئے مگر موسی نے اسے نہیں چھوڑا۔ مارے خوف کے لڑکے کا رنگ فق ہوگیا اور موسی رونے لگی۔

جانے کیسے اس غیظ کے عالم میں بھی دل بھر آیا۔ میں چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا اور دیر تک باہر نہیں نکلا۔

ہم دونوں میاں بیوی نہ جانے کیسے کاروبار چلاتے ہیں اور لوگ ہمیں بہت کامیاب سمجھتے ہیں بیسیوں طعنے ملتے ہیں اور جھوٹ سچ بیسیوں باتیں ہماری تیز اور ہوشیاری کے بارے میں مشہور ہو گئی ہیں لیکن حساب کتاب سے ہم دونوں کی جان جاتی ہے۔ تالے چابیاں اس جنم میں تو ہم سنبھال نہیں سکتے۔ اگلے جنم کا حال خدا کو معلوم ہے۔ یہ بات نہیں کہ ہم تالے نہیں لاتے۔ کئی بار دس دس تالے لاتے ہیں اور سب جگہ لگاتے ہیں، پھر ایک جگہ کا تالا دوسری جگہ چلا جاتا ہے اور کیسے چابیاں گم ہو جاتی ہیں، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ چابیاں ٹانگنے کے لئے دفتر اور گھر دونوں میں دیوار پہ بورڈ لگوائے ہیں۔ ان پہ ٹبک اور چابیوں پر کارڈ بورڈ کی چھوٹی چھوٹی تختیاں لگا کر دفتر اور گودام، دفتر، ٹرنک وغیرہ لکھوائے ہیں لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔ گھر میں سب کچھ عموماً کھلا رہتا ہے ہم باہر جاتے وقت کواڑ بند کیے بغیر نکل آتے ہیں اور موسی کو آواز دے کر کہتے ہیں "موسی، ہم باہر جا رہے ہیں گھر کھلا ہے"۔ موسی سب دروازے کھڑکیاں بند کرتی ہے باہر کا تالا نہ ملے تو کچن کا تالا لگاتی ہے اور ہم بے فکر گھومتے ہیں۔

ایک بار ہمیں شام کو کسی سے ملنے جانا تھا اور وقت سے پہنچنا تھا۔ بیوی نے کپڑے بدل کر دراز سے کانوں کے آویزے اور لاکٹ نکالا مگر میرے جلدی مچانے کی وجہ سے انھیں پہنتے ہی وہ باہر نکل آئی اور دراز بند کرنا بھول گئی۔ موسی کو آواز دی کہ گھر سنبھالو اور ہم چلے۔

جب ہم کافی دور نکل آئے تو بیوی نے کہا "میں دراز بند کرنا بھول گئی، چابی شاید اسی میں لگی رہ گئی"۔

میں نے غصہ سے کہا "اب چلو، جو ہونا ہے، اب تک ہو چکا ہوگا"۔

دراز میں نہ صرف بیوی کے زیورات تھے بلکہ دفتر کے ہزار ڈیڑھ ہزار روپے بھی تھے۔

جب ہم رات کو واپس آئے تو دیکھا موسی سب دروازے بند کیے باہر برآمدے میں بیٹھی ہے۔

"موسی، دروازے ہمارے جاتے ہی بند کر لئے تھے؟" بیوی نے پوچھا۔

"ہاں بہو"

"کوئی آیا تو نہیں تھا؟"

"نہیں بھو"

بیوی نے چابی لی اور کمرہ کھول کر اندر جا کر دیکھا۔ دراز ویسی ہی نصف بند نصف کھلی تھی۔ چابی اس میں لگی تھی اور ساری چیزیں جوں کی توں رکھی تھیں۔

ایک بار ہم باہر سے آئے۔ شاپنگ کرنے گئے تھے۔ بیوی نے دس دکانیں دیکھیں چیزیں دیکھیں پسند کیں مگر خریدی ایک نہیں۔ میری بیوی کی عادت ہے کہ ایک ہی بار میں کوئی چیز نہیں خریدتی پسند کر کے رکھ آتی ہے اور دوسرے دن تیسرے خریدتی ہے۔ ہم بے حد تھک گئے تھے۔ آکر باہر برآمدے ہی میں بیٹھ گئے۔ شاید کچھ دوست آگئے تھے، یا چائے کی بات ہوئی، رات کو دیر سے سوئے، صبح موسی چائے لائی تو اس کے ہاتھ میں میری بیوی کا ہینڈ بیگ تھا۔ جو وہ رات کو باہر ہی بھول گئی تھی۔ چار پانچ سو روپے، جو وہ ساتھ لے گئی تھی، جوں کے توں رکھے تھے۔

"اب تو ایہر اُدھر بٹوا رکھ دیتی ہیں۔ کھو جائی تو آپھت ہم گریبن کر آئی"۔ موسی نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے بیوی سے کہا۔

"اتنی بار چیزیں گم ہوئی ہیں اماں۔ کبھی تمھاری آفت آئی ہے؟" بیوی نے کچھ ایسے لہجہ میں کہا جس میں مسرت کے ساتھ ساتھ ہلکے لاڈ کی آمیزش بھی تھی۔ جب وہ بہت خوش ہوتی ہے تو ہمیشہ اسے اماں کہہ کر پکارتی ہے۔

اور بیوی کی یہ بات درست بھی ہے۔ موسی سے اور بیسیوں شکایتیں ہوں، یہ شکایت کبھی نہیں ہوئی —— ترکاری پڑی پڑی سڑ جائے گی، پھل مرجھا جائیں گے، دہی خراب ہو جائے گا، دودھ پھٹ جائے گا لیکن ہاتھ نہیں لگائے گی، جب ہم چلائیں گے کہ جب دوسرا کھانے والا نہیں تھا تو تم نے خود کیوں نہیں کھا لیا تو اس کا صرف ایک ہی جواب ہوتا ہے "تو ہم کاہے نہ بے کیسن لیئی لیتے"۔

میری بیوی اور میں چونکہ کئی بار صبح آٹھ بجے سے لے کر رات کے آٹھ بجے تک دفتر میں کام

کرتے رہے ہیں اس لیے گھر دیکھنے والا کوئی نہیں اور کبھی کبھی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ایسی عورت گھر میں رہے جو کپڑے، لتے، گہنے پاتے کی دیکھ بھال کر سکے اور وقت سے سبزی ترکاری منگا کر کھانا کھلوا سکے۔ بمبئی میں رہتے تھے تو وہاں ایسی مہ بندڑ آیا بن جاتی تھی، جو یہ سب کام خوش اسلوبی سے انجام دے لیتی تھی لیکن الہ آباد میں ایسی سہولت نہیں، پچھلے دنوں میری بیوی نے ایک دور پار کی رشتہ دار خاتون کو گھر میں رکھ لیا۔ انھوں نے آہستہ آہستہ گھر پر قبضہ جما لیا۔ بدقسمتی سے ان دنوں گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کچھ اس طرح وقت سے کھانے کا انتظام کیا، خود رکشا لے بازار سے سبزی ترکاری لا کر نئی سے نئی سبزیاں، اور پھل کھلائے کہ جی بے حد خوش ہوا۔ آہستہ آہستہ انھوں نے گودام کو تالا لگا دیا۔ ڈولی کو مقفل کر دیا۔ بہت دنوں تک یہ بات مجھ سے چھپی رہی لیکن ایک دن جب میں بے وقت کھانے بیٹھا اور میں نے اچار مانگا اور موسی ان سے چابی مانگنے گئی تو مجھے بہت الجھن ہوئی۔

"یہ تالا کیوں لگایا جاتا ہے؟ کون ہے جو یہ کھانے کی چیزیں اٹھا لے جائے گا؟" میں بڑبڑایا۔

چار چھ ماہ کام ٹھیک چلا۔ پھر آہستہ آہستہ دو ایک بار کچن میں موسی سے ان سے تکرار ہو گئی۔ پھر گھر سے چیزیں غائب ہونے لگیں، یوں ہی اِدھر اُدھر رکھے ہوئے پیسے روپے غائب ہوئے، اِدھر اُدھر پڑے کپڑے غائب ہوئے، کچھ برتن غائب ہو گئے۔ دبی زبان سے ان خاتون نے کہا کہ آپ نے موسی، اس کی بہن اور گھر میں صفائی کرنے والی جمعدارنی کو بہت چھوٹ دے رکھی ہے۔

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا اور میں نے کہا۔ "ماتاجی، آٹھ برس سے یہ لوگ کام کرتی ہیں۔ یہاں سے کبھی کوئی چیز نہیں گئی۔

ایک دن میں شام کو دفتر سے ڈرائنگ روم میں آیا تو موسی شکایت آمیز لہجہ میں بڑبڑانے لگی۔

"بوڑھا بوڑھا کھات ہیں اور بچین لوگ موہنہ تاکت ہیں۔"

پوچھنے پر معلوم ہوا کہ لڑکا اسکول سے آیا تھا۔ ڈولی مقفل تھی۔ ماتاجی کہیں گئی ہوئی تھیں اور بچے کو ناشتہ نہیں ملا۔ موسی نے بتایا کہ وہ خاتون خوب کھاتی ہیں اور بچوں کو بتا تُلا دیتی ہیں۔ لڑکوں نے بھی شکایت کی کہ جب دیکھو ڈولی میں تالا لگا رہتا ہے۔

اسی رات میں نے ان سے چابی لے لی اور کہا کہیں تالا والا لگانے کی ضرورت نہیں کچھ دن بعد وہ چلی گئیں، جاتے جاتے کچھ اور چیزیں اٹھاے گئیں لیکن ہم نے چین کی سانس لی۔

انھیں گئے ایک سال ہو گیا ہے۔ گھر کھلا رہتا ہے۔ کپڑے لتے، روپے پیسے اسی طرح کھلے رہتے ہیں لیکن کسی چیز کے گم ہونے کی شکایت نہیں سنائی دی۔ موسی بدستور گھر سنبھالے ہوئے ہے۔

میری پہلی بیوی سے ایک لڑکا ہے، جواب بڑا ہو گیا ہے اور کالج میں پڑھتا ہے، وہ میرے ساتھ کم ہی رہا ہے۔ پہلے اپنی دادی کے پاس رہا، پھر چچاؤں، تایوں کے پاس، پھر آیا تو کئی بار گھر سے بھاگ گیا ہے۔

پچھلی بار وہ بمبئی بھاگ گیا اور دو سال وہاں اس نے بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔ کافی تجربے حاصل کئے اور واپس آیا تو میں نے اُسے کافی سلجھا ہوا پایا۔ سیرت میں وہ اپنی ماں پر ہے۔ بے حد حساس، فراخ دل اور کم گو۔ عام نوجوانوں کی طرح وہ اپنے والدین کو کئی باتوں میں اپنی نسبت قدرے کم سمجھدار پاتا ہے۔ اسے اس بات کی شکایت ہے کہ ہم کیوں اتنا چلاتے ہیں کیوں نہیں ایسا انتظام کیا جاتا کہ موسی کو ڈائننگ روم میں بیٹھے بیٹھے وقتاً فوقتاً آواز دینے کی ضرورت نہ پڑے۔

پچھلے سال کی بات ہے کہ ایک دن میں نے دیکھا، وہ کچن میں بجلی کی گھنٹی فٹ کروا رہا ہے۔ کھانے کا کمرہ کچن سے دور ہے۔ کافی لمبا تار لگانا پڑا۔ بٹن ڈائننگ روم میں فٹ کروا کے اس نے میری طرف فخریہ انداز سے دیکھا گویا کہہ رہا ہو "ہوں گے آپ بڑے توپ ادیب لیکن ابھی میں آپ کو بہت کچھ سکھا سکتا ہوں، اب دیکھئے، بھلا کوئی ضرورت ہے موسی کو چیخ کر بلانے کی، چپکے سے گھنٹی بجا دی، وہ خود بخود گھنٹی کی آواز کے ساتھ کھنچی چلی آئے گی۔ آپ لوگ ہیں کہ چلا چلا کر احاطہ سر پہ اٹھا لیتے ہیں۔

لیکن موسی کبھی گھنٹی کی آواز کے ساتھ نہیں آئی۔

کھانا کھاتے کھاتے کسی چیز کی ضرورت پڑتی ہے یا موسی روٹیاں لانے میں دیر کرتی ہے تو میرا لڑکا گھنٹی کا بٹن دباتا ہے۔ موسی نہ جواب دیتی ہے نہ آتی ہے۔

لڑکا کچھ دیر انتظار کرتا ہے اور اب کے دوبارہ بٹن دباتا ہے۔

موسی پھر بھی کوئی جواب نہیں دیتی۔

کچھ جھلاہٹ کے ساتھ وہ پھر بٹن دباتا ہے دبائے رہتا ہے اور گھنٹی دیر تک بجتی رہتی ہے۔

موسی کی طرف سے پھر کسی قسم کی سن گن کا پتہ نہیں ملتا۔

پھر وہ اپنی فطری سنجیدگی کو بالائے طاق رکھ کر، بظاہر خاموش لیکن بہ باطن جھلایا ہوا کچن میں پہنچتا ہے۔

موسی روٹی بیل رہی ہے یا انگیٹھی کو دھونک رہی ہوتی ہے یا آٹا سان رہی ہوتی ہے۔

"موسی تمھیں گھنٹی نہیں سنائی دی؟"

"سنت تو رہے"

"تو پھر جواب کیوں نہیں دیا؟"

"دیکھت تو ہو۔ ہم کا کھالی ہے۔"

"تمھارے ہاتھ آٹا سان رہے یا زبان بھی آٹا سان رہی ہے؟"

موسی اس کا کچھ جواب نہیں دیتی۔ سر اٹھا کر پوچھتی ہے۔ "کا کہت ہو؟"

"کہتے ہیں تمھارا سر" لڑکا کہنا چاہتا ہے مگر کہتا نہیں بھنبھنایا ہوا آکر بیٹھ جاتا ہے اور منہ پھلا لیتا ہے۔

میں مسکراتا ہوں تو اس کا منہ اور بھی پھول جاتا ہے۔

اور اب سال بھر بعد عالم یہ ہے کہ گھنٹی اور موسی اپنی جگہ برقرار ہیں اور ہمارے گھر کا کام پہلے ہی کی طرح چلتا ہے

جوگندر پال

حلقۂ دامِ خیال

میری آنکھ لگ گئی ہے۔

مگر اپنے بند پپوٹوں کے اندر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مجھے باہر کی کل کائنات دکھائی دے رہی ہے، گویا میں سوتے سوتے جاگ رہا ہوں اور میری بند آنکھوں نے زندگی کے اس گھنے خوفناک جنگل پر ٹکٹکی باندھ لی ہے جہاں سورج کی ایک شعاع کا گذر کبھی ممکن نہیں، لیکن تاریکی کے باطن میں گھس کر مجھے ہر شے بخوبی نظر آ رہی ہے اور میں گویا ان اشیا کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہا بلکہ انھیں انھی کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور اس سے میری بینائی کئی گنا بڑھ گئی ہے۔

نینا! نینا! نینی!

وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہے، پر خود اپنی آنکھوں سے کیونکر چھپ سکتی ہے، وہ میرے سامنے کھڑی ہے، یہ!

روؤ نہیں نینی، میں مروں گا نہیں، تمھارے لئے زندہ رہوں گا۔ لیکن ایسی زندگی کا کیا کروں؟ دیکھو نا میری بیماری کا بوجھ ڈھو ڈھو کر تمھاری کیا صورت نکل آئی ہے۔

میں ٹھیک ہوں، آپ بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔

ٹھیک تو اب میں مر کے ہی ہوؤں گا، پر گھبراؤ نہیں ابھی نہیں مروں گا، لیکن میری خواہش ہے نینی کہ میری پیدائش از سرِ نو ہو — اور —

اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ میری مرحوم ماں آکاش سے نیچے اتر رہی ہے، وہ میرے قریب آگئی ہے، اور قریب اور مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا ہے اور میں اپنے بستر پر نہیں، اس کے پیٹ میں ہوں اور اس کے

پیٹ سے باہر آکے اس کی چھاتیوں پر منہ رکھنے کو بے تاب ہوں، میں از سرِ نو پیدا ہو رہا ہوں، ننھا منا سا، سالم، تندرست، دنیا کی ہر بیماری سے مبرا، میں انگوٹھا چوس رہا ہوں اور میری ماں میری طرف دیکھ دیکھ کر میرے تابناک مستقبل میں جھانک جھانک کر از خود مسکرائے جا رہی ہے۔ میرا لعل بڑا ہوگا، میں بڑا ہو رہا ہوں، اسکول جائے گا، میں اسکول جا رہا ہوں، اپنے سارے امتحان پاس کرے گا۔۔۔ ماں! ماں! میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوا ہوں۔ ماں! او موری ماں!۔۔۔ میری زبان پر لڈو کا ذائقہ گھل مل رہا ہے، فرطِ مسرت سے چہرہ تمتما رہا ہے اور میں اپنی ماں سے بغلگیر ہو گیا ہوں اور اس نے میرا منہ چوم لیا ہے۔

کئی بار کہا ہے ماں، میرا منہ نہ چوما کرو۔

ماں نے ایک بار پھر میرا منہ چوم لیا۔

ماں۔! میں شرما کر احتجاج کر رہا ہوں اور مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں اب بچہ نہیں رہا، میرا ابھرا ابھرا جسم اور بھر ابھر الگنے لگا ہے۔ میں جوان ہو گیا ہوں۔

کیا تم اب بھی مجھے بچہ ہی سمجھتی ہو ماں؟

کوئی جواب دینے کے بجائے وہ مجھے دودھ بھری آنکھوں سے دیکھنے لگتی ہے اور میں گویا اس کی گود میں لیٹا ہاتھ پیر مار مار کر ضد کر رہا ہوں۔

"میں اب بچہ نہیں ہوں ماں۔

تو کیا تمھاری شادی کر دیں اب؟

شادی! لیکن نینا کا خیال نینا کو دیکھے بغیر آسکتا ہے؟

نہیں ماں میں شادی نہیں کروں گا۔ مجھے بہت کچھ کرنا ہے!

میں اپنے مستقبل کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے جھجک جھجک کر ہاتھ بڑھا رہا ہوں، نہایت آہستگی سے جیسے کوئی کسی کے گھر پہلی ملاقات کو آیا ہو۔ تھپ۔ پ! اندر سے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ تھپ! اندر بدستور خاموشی ہے۔ کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ ٹھک! بوکھلا کر میں نے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا ہے۔

کون ہے ؟

میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اپنے متعلق کیا کہوں ۔

کون ؟

م ۔ میں ۔

میں؟ دروازہ کھلتا ہے ۔

میرے سامنے بڑا خوبصورت مستقبل کھڑا ہے ۔ نینا !

آئیے !

میں ـــــ

آئیے نا !

میں ـــ میں ـــ

نینا ہنس رہی ہے ، آپ اپنے متعلق کیا کہنا چاہتے ہیں ؟

مَیں ـــ

میرا مستقبل کھلکھلا کر ہنسنے لگا ہے ۔

(نہیں ابھی زندہ ۔ دیکھو سا کن چہرے پر سپنوں کا جال ہل رہا ہے ۔

لیکن نبض ـــ

نبض کا کیا ہے ـــ)

نینا بدستور ہنس رہی ہے ، میرے تاریک باطن میں رچی بسی روشنی کے مانند ، اور میں بھی ہنسنے لگا ہوں اور اتنی بڑی خوشی کہ خوش آمدید کہتے ہوئے میں اس قدر خوش ہوں کہ مجھے ڈر لگنے لگا ہے ۔ کیا پتہ یہ خوشی میری نہ ہو؟ کیا پتہ یہ مجھ سے ناراض ہو؟ اور ـ اور ـــ نہیں ! نینا نے ہنستے ہنستے میرے گلے میں ہار پہنا دیا ہے اور میں نے اسے گلے لگا لیا ہے اور شادیانے بجنے لگے ہیں ، پنڈت ہمارے وِواہ منڈپ میں بہ آواز بلند سنسکرت کے شلوک پڑھ رہا ہے اور اپنے دھرم کے پراچین دیوتاؤں کی یہ زبان مَیں بالکل نہیں سمجھ رہا لیکن مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ دیولوک کی اس مکمل زبان سے میرے جذبہ اظہار کی تمام تر تسکین

ہو رہی ہے، دیوتاؤں کا گرو گیان مدیرا پی کے، بے حد مدہوش کے گا گا کے ایک نہایت دلکش صوتی آہنگ میں ڈھل رہا ہے، میں اس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ رہا لیکن آہنگ کا کوئی لغوی معنی نہیں ہوتا، آہنگ اپنا مطلب خود آپ ہے، اس لئے اپنے آپ میں ہی اپنے آپ کو ادا کرتی ہے۔

میں بڑا خوش ہوں، اتنا خوش کہ میرا دل اچانک شدید اختلاج میں مبتلا ہو کر منہ کی طرف اچھلنے لگا ہے۔ خون کے بے حد تیز دور کی تاب نہ لا کر رگیں پھٹنے لگی ہیں اور دیوتاؤں کی بانی پر کان دھرے میں اپنی دھرتی کی گود میں آ گرا ہوں اور اس کی چیخ سن کر بے ہوش ہو گیا ہوں۔

میں سو رہا ہوں اور عالم خواب میں بے ہوش ہو گیا ہوں لیکن اس دوہری بے ہوشی کے باوجود میں پورے ہوش میں ہوں اور اپنے بے ہوش وجود کو تک رہا ہوں۔ آس پاس کی بدحواس خاموشی میں ابھی تک سنسکرت کے شلوک سنائی دے رہے ہیں، میری ماں گھبرا کے میرے اوپر جھکی ہوئی ہے۔ نینا کے ہاتھوں کی مہندی کی خوشبو میری پیشانی کے پسینے میں جذب ہو رہی ہے، یہ لمس! جیسے مر کر سورگ میں آ پہنچا ہوں۔ (یہ رو کون رہا ہے؟ کـ ــ؟ ــــ) وہ ڈاکٹر انکل کھڑے ہیں اور بڑا گمبھیر منہ بنا کر پتاجی سے کہہ رہے ہیں کہ بلی کو یہاں سے اٹھا کر اندر بستر پر لٹا دو۔ دو چار آدمیوں نے نہایت احتیاط سے مجھے اٹھا لیا ہے، پتاجی بھی سہارا دینا چاہتے ہیں لیکن ان کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔

کیا میں زندہ ہوں یا مر چکا ہوں؟ اگر مر چکا ہوں تو بالکل کیوں نہیں مرا؟ مجھے پتاجی کا ہارا ہارا سا نظر آنا، کچھ ہو جانے کے خوف سے کانپنا قطعاً پسند نہیں۔ میرے لئے ان کی ہستی ہمیشہ ایک ٹھوس طاقت کی پیامبر رہی ہے اور ان کی یہی شکل مجھے محبوب ہے، چٹان جو طوفان کے تند تھپیڑوں کے باوجود اپنی جگہ پر تن کر ڈٹی رہتی ہے، خوشی میں خوش نظر آتی ہے نہ غم میں غمگین، اور جس کے وجود کی مٹی اس کی قوتِ ارادی سے فولاد ہو گئی ہے۔ دراصل پتاجی کی سخت گیری ان کے ضبط سے مجھے اپنے تحفظ کی خبر رہتی ہے، گویا ان کا استحکام میری حفاظت کے لئے میرے ارد گرد ایک سنگلاخ دیوار کے مانند کھڑا ہو۔ لیکن اب اس فصیل میں چھید ہو رہے ہیں اور بارود کے ریزے اچھل اچھل کر میری روح میں کھب رہے ہیں۔ حملہ آور دشمنو، گولا باری بند کرو، مجھے اپنی ہار قبول ہے، آؤ اور بلا جھجک مجھے قتل

کردو، آؤ میری دیوار ڈھے رہی ہے۔

میں بستر پر لیٹا ہوں اور پتاجی اپنی دائیں آنکھ کو بار بار رومال سے خشک کر رہے ہیں اور بائیں آنکھ سے آنسوؤں کی دھار بہہ بہہ کر ان کی سفید داڑھی کو سیراب کر رہی ہے۔ گویا دھرتی رو رو کر اپنے جسم سے بوند بوند نچوڑ کر اپنی تہہ میں بیج کو پانی دے رہی ہو۔

اپنے ایم۔ اے۔ کا رزلٹ سن کر میں تیز تیز چل کر پتاجی کے سامنے آ کھڑا ہوا ہوں۔

پتاجی!

میں ان کے پاؤں چھو رہا ہوں اور وہ میرے دائیں کندھے کو ذرا دبا کر ہلا رہے ہیں۔

پتاجی!

ایک خوشی مجھ میں دوسری خوشی کا بھی حوصلہ پیدا کر رہی ہے۔

میں نینا سے شادی کرنا چاہتا ہوں پتاجی!

مجھے معلوم ہے کہ پتاجی نہیں چاہتے کہ ابھی میری شادی ہو۔ اس سے پہلے وہ مجھے مزید تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیجنا چاہتے ہیں لیکن بیج جب دھرتی کے اندر پھوٹ کر باہر آ جانا چاہتا ہے تو دھرتی اپنا سینہ پھاڑ کر بھی اسے راہ دے دیتی ہے اور وہ باہر نکل کر جھومنے لگتا ہے۔

الم ناک فضا کی خاموشی ابھی تک سنسکرت کے شلوک دہرا دہرا کر انسانی نسل کی بقا کا پیغام دے رہی ہے اور میں بستر پر بے ہوش پڑا ہوں اور پتاجی ڈاکٹر انکل سے پوچھ رہے ہیں کہ کوئی خطرے کی بات تو نہیں۔ خطرے کی بات، میری موت کی بات، ہر خوشی کی انتہا سے غم کی ابتدا ہوتی ہے، شادی تو محض باہر کی شے ہے، قالب ہے اور اس قالب کی روح غم ہی ہے، ہمارے غم ہی سے ہماری ساری خوشی کا وجود قائم ہے۔ میں سب جانتا ہوں ڈاکٹر انکل، آپ پتاجی کو صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہوا ہے، چوبیس برس کی عمر میں ہی میرا دل روگی ہو گیا ہے، پر ڈاکٹر انکل؟ میری ماں کو یہ سب نہ بتانا، وہ بے چاری بھی دل کی روگی ہے، اس خبر کی تاب نہ لا سکے گی، اور نینا، نینا کو میں خود دھیرے دھیرے اس خبر کے لئے تیار کروں گا، وہ میری تقدیر ہے، میری تاریک ہستی کا روشن مستقبل ہے، میں مٹ کر بھی یہی چاہوں گا کہ میرا یہ مستقبل بنا رہے، میں اپنے اس مستقبل کو اجڑنے سے

بچالوں گا ڈاکٹر انکل، میں ٹھیک ہو جاؤں گا، ٹھیک ہوئے بغیر میرے لئے اور کوئی چارہ ہی نہیں۔
میری بے ہوشی ٹوٹ جاتی ہے اور میں آنکھ کھول کر مسکرانے لگتا ہوں۔

ڈاکٹر انکل ہیں اب ٹھیک ہوں۔

لیکن میری مسکراہٹ آبدیدہ ہے۔

ہاں، تم ٹھیک ہو بچے

لیکن ڈاکٹر بھی جانتا ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ میں ٹھیک نہیں ہوں، میرے دل میں درد ہو رہا ہے اور نینا میری پائنتی بیٹھی سر جھکائے میرے تلوؤں پر اپنے ہاتھوں کی مہندی مل رہی ہے۔

میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر انکل!

میں اٹھ کر بیٹھ جانا چاہتا ہوں، تندرست انسانوں کی طرح بھاگنا دوڑنا چاہتا ہوں۔
لیکن میرے دل میں درد ہو رہا ہے اور مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے اندر زندگی کی کوئی اہم کل ٹوٹ پھوٹ گئی ہو۔ ابھی چنگی بھلی چل رہی تھی پھر یک لخت بے حد تیز ہو گئی، اور تیز اور پھر اتنی تیز کہ ٹوٹ گئی۔ میرے دل میں درد پھر بڑھ رہا ہے، نینا کے ہاتھوں کی مہندی اس کے پسینے کے ساتھ نکل نکل کر میرے تلوؤں میں دھنس رہی ہے، پتا جی میرے چہرے پر ٹکٹکی باندھے نہ جانے کیا سوچ رہے ہیں۔

پتا جی!

سو جاؤ، بیٹا!

میں نینا کی طرف دیکھنے لگتا ہوں۔

سو جاؤ!

ہاں، مجھے بے خوف و خطر سو جانا چاہئے، کیونکہ میری تقدیر جاگ رہی ہے اور تقدیر خود آپ چوکیداری کر رہی ہو تو سب کچھ اپنے آپ ٹھیک ہو جاتا ہے، اجڑی ہوئی تدبیریں آنکھیں مل مل کر بیدار ہوتی ہیں تو حیران رہ جاتی ہیں، ان کے ہاتھ پیر ہلائے بغیر سب کام پورے ہو جاتے ہیں۔

میں بے فکر ہو کر سو جاتا ہوں۔

اب مر گیا ہے بے چارہ

نہیں ابھی زندہ ہے! کیا یہ چہرہ مرا ہوا لگتا ہے؟

لیکن دھڑکن —؟

یہ میرے پیروں پر سر رکھے کون بیوہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ہے؟ — ک —؟

میں سو رہا ہوں، یعنی سوتے ہوئے خواب دیکھ رہا ہوں کہ میں سو رہا ہوں، یعنی اپنے اندر داخل ہو کر اور اندر چلا آیا ہوں۔ یہاں اندھیرا اور گہرا ہے اور اس گھور سیاہی میں ہر شے اور صاف نظر آنے لگی ہے، گویا روشنی تاریکی ہی کے ضمیر کا نام ہو، جوں جوں اندھیرے کے اندر ہی اندر قدم دھرتے جاؤ گے روشنی کے قریب تر ہوتے جاؤ گے۔ کیا ہم مر کر تاریکی کا روشن ضمیر چھو لیتے ہیں اور اسے چھو کر یہی بن جاتے ہیں؟ یہی مقام ہمارے سفر کی انتہا ہے کیا موت ہی زندگی کا ضمیر ہے جسے پا کر ہم اپنے جسم کی ضرورت سے آزاد ہو جاتے ہیں؟ چھوئے بغیر چھو سکتے ہیں، بولے بغیر بول سکتے ہیں، دیکھے بغیر دیکھ سکتے ہیں؟

میں اٹوٹ نیند میں ڈوبا ہوا ہوں، بیک وقت زندگی کی ان تہوں میں بھی موجود ہوں اور زندگی کی سطح پر بھی، کیونکہ میں آپ اپنی زندگی ہوں، اور اس لئے میں جہاں کہیں ہوں، اپنے جسم کے ساتھ یا اس کے بغیر، میری زندگی میرے ساتھ ساتھ ہے، ایک دفعہ 'ہو جانا'، اس امر کی علامت ہے کہ آدمی اب ہمیشہ کے لئے 'ہو گیا ہے'۔ شاید اسی لئے ہمارے پیغمبروں نے ہماری روح کو غیر فانی قرار دیا ہے۔

میں اپنی روح کی ابدیت کے خیال کے پیچھے پیچھے کیوں ہو لیا ہوں؟ اس لئے تو نہیں کہ کہیں اپنی راہ مجھے موت تک نہ لے آئے؟ شاید مجھے مرنے سے ڈر محسوس ہوتا ہے، ہمارے سبھی ہیرو موت کی قربت محسوس کرتے ہیں تو خوف زدہ ہو ہو کر ابدیت کے فلسفہ میں پناہ لیتے ہیں تاکہ آسانی سے مر سکیں۔ ان کی موت پر جب ہم انھیں مسکراتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کی خنداں پیشانی کا نقش ہمارے ذہن پر ثبت ہو جاتا ہے، اور پھر اپنی موت پر بھی ہم مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں، مسکراتے ہوئے نظر بھی آنے لگتے ہیں لیکن اپنے خوف کو دباتے ہوئے ہیں اور زیادہ خوف کا احساس ہونے لگتا ہے۔

میں سوچ رہا ہوں اور سوچتے سوچتے دیکھنے لگا ہوں کہ میرا ایک دوست راجو اور میں، ہم اسکول

کے دو لڑکے، میونسپل گارڈن میں ایک جھاڑی قریب کھڑے ہیں اور چند قدم کے فاصلے پر ایک کالا ناگ پھن پھیلائے ہماری جانب گھور رہا ہے اور میں خوف سے تھر تھر کانپ رہا ہوں مگر راجو خوف سے مسکرا رہا ہے اور مسکراتا مسکراتا سانپ کے کاٹنے سے پہلے ہی ڈھیر ہو جاتا ہے۔

مجھے شروع سے ہی ہر خوف ناک شے سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ مجھے بزدل لوگ پسند نہیں لیکن میں خود بڑا بزدل ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے بڑی محبت ہے، یا ان سے، جو میرے ہی ہوں، اور مجھے یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ مجھے یا ان میں سے کسی کو کچھ ہو جائے گا اور اگر کچھ ہو گیا تو — تو — میرے چہرے پر لاغر سی مسکراہٹ چلی آتی ہے۔ ابھی کیا ہونا باقی ہے؟ — تم کئی ماہ سے بستر پر پڑے ہو، تمھاری ماں کی حالت الگ نازک ہے۔ شاید آج یا کل وہ چلتی بنے۔ اگر ماں چلی گئی تو پتاجی کا کیا ہوگا؟ — اب پتاجی کی عینک نہیں مل رہی ہے۔ یہ لیجیے۔ اب ان کی چھڑی کھو گئی ہے۔ یہ پڑی ہے، لیجیے اب وہ پریشان ہو رہے ہیں کہ انھوں نے اپنی کتاب پڑھتے پڑھتے کہاں رکھ دی تھی۔ یہ تو رکھی ہے — بڑی کی ماں، جب تک تم ہو، میں کبھی کچھ نہ کھوؤں گا، میرا سب کچھ قائم رہے گا۔ میرا سارا بھروسہ تمھارے ہی دم سے ہے بڑی کی ماں! تمھارے بغیر میرا اپنا آپ بھی کھو جائے تو مجھے خبر نہ ہو۔

یہ سب لوگ مجھ سے چھپا رہے ہیں مگر مجھے علم ہے کہ ماں مر رہی ہے اور آج کل دم ہی وہ بستر چھوڑ کر چل نکلے گی۔ جب بھی اسے کہیں اکیلے سفر پر جانا ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ صبح سویرے ہی گھر سے نکل جاتی ہے تاکہ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے وہ اپنی منزل پر جا پہنچے، اور یہ سفر تو بڑا لمبا ہے، سورج کی شعاعوں کے مانند طویل۔ مجھے یقین ہے کہ ماں مر رہی ہے اور یہاں سے چوتھے کمرے میں سب لوگ جمع ہیں اور بجھتی ہوئی شمع پر آنکھیں گاڑے ہوئے ہیں۔ مگر ماں کی بجھتی ہوئی آنکھیں پتاجی کے قمیص کے بٹنوں پر جمی ہوئی ہیں۔ ادھر آئیے، یہ بٹن ٹوٹا ہوا ہے، ذرا ٹانک دوں — چٹان سے چشمہ ابلنے لگا — ارے — رے! یہ اندھیرا کیوں ہو گیا ہے؟ روشنی — رو — شنی! یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ میرا بایاں پہلو — ! یہ بایاں ہاتھ، یہ ٹانگ، یہ کندھا! یہ میرا نہیں، میں مفلوج ہو رہا ہوں! نینی! نی! آ — میں مر رہا ہوں، دیکھو میری قمیص کے سارے بٹن ٹوٹ گئے ہیں، میرا جسم میرے کپڑوں سے

باہر آ رہا ہے ___ میں ۔ میں ۔ ۔ یہ ۔ میرا بایاں پہلو کہاں ہے؟ یہ پہلو میرا نہیں، یہ مر گیا ہے، میں اپنا نصف رہ گیا ہوں، میں آدھا مر گیا ہوں آدھا زندہ ہوں، میرا آدھا مردہ جلا دو تاکہ اپنے بقیہ نصف جسم سے میں تندرست لوگوں کی طرح چل پھر سکوں، یا میری مرحوم ماں کو بلاؤ، سدا کے لئے اس قبر میں پڑا رہنے کی بجائے میں پھر سے اس کے پیٹ میں الٹا لٹکنا چاہتا ہوں ___ ماں، مجھے ایک بار پھر جنم دو، مجھے اپنا سالم وجود چاہئے، اگنی کے سامنے دیوتاؤں کے من پسند سنسکرت کے شلوکوں میں مجھ سے قسم لی جا چکی ہے کہ میں اپنا پورا وجود نینی کو ارپن کروں گا۔ میں اپنا یہ وعدہ پورا کرنا چاہتا ہوں، گھبراؤ نہیں نینی، میں اپنا یہ محبوب وعدہ پورا کروں گا ___ مجھے ایک اور وجود دو ماں، مجھے پھر سے بناؤ ماں، ماں ___ ما ___ آں ___ م ___ !

میں اپنی نیند میں جاگ رہا ہوں اور وقت سویا ہوا ہے اور میں بھی سو جانا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے نیند نہیں آ رہی۔

نینا! نی ___ !

آپ سو جائیے۔

ہاں، اب مجھے سو جانا چاہئے۔ بہت جاگ لیا، اب مجھے ہمیشہ کے لئے سو جانا چاہئے، میں اپنی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ موت سے مجھے ڈر لگتا ہے لیکن تم ٹھیک کہتی ہو نینی، اب مجھے سو جانا چاہئے۔ تم سب کو میرے سو جانے کا دکھ ہوگا، ہوگا نا نینی؟ ___ لیکن میری آنکھوں سے نیند اڑ گئی ہے۔ یہ ناگن سی لمبی رات کیوں کر کٹے گی؟ ڈاکٹر انکل کو بلا کر مجھے مارفیا کا ایک انجکشن لگوا دو نینی، جب تک موت ڈنک نہیں مارتی، مجھے ایک چھوٹی سی موت دے دو پلیز۔ پلیز، پلیز نینی!

میرے خون میں مارفیا جا رہا ہے۔ میرے خون کے بے چین کیڑے بے ہوش ہو رہے ہیں، میری آنکھیں مند گئی ہیں، میں شاید واقعی سو رہا ہوں، جانے کب سے۔ میرے سامنے نینی بیٹھی ہے، اس قدر اداس نظر آ رہی ہے جیسے وہ صرف روح ہی روح ہو۔ تصویروں کے چہرے بھی ہشاش بشاش ہوں تو وہ سچ مچ کے لگتے ہیں لیکن سچ مچ کے چہرے اس طرح مایوس اور محروم ہوں تو لگتا ہے کہ ہوا میں یوں ہی ان چیزوں کی تصویریں بن گئی ہیں ___ میرے قریب آؤ نینی، تاکہ تمہیں چھو کے

دیکھوں کہ تم ہو یا نہیں ہو۔ سنسکرت کے شلوک اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ تم اب کنواری نہیں ہو۔ لیکن نینی، تم جانتی ہو کہ اب تک تم کنواری ہو۔ اور ـــــ اور اس وقت تک کنواری رہو گی جب تک تمھارا شوہر زندہ ہے ـــــ کئی بار مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم کہیں مجھے چھوڑ کر چلی نہ جاؤ، پر نینی، تم واقعی چلی جاؤ تو ٹھیک ہے، تم جوان ہو تندرست ہو اور تمھیں ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچ کر وہاں سے ساری دنیا کا نظارہ کرنا ہے، مجھے اپنا وعدہ یاد ہے کہ تمھیں دنیا کی سب سے اونچی چوٹی پہ لے جاؤں گا لیکن میری ہمت اب جواب دے چکی ہے نینی، میرے دل و دماغ یخ بستہ ہو چکے ہیں، میں مر رہا ہوں، مجھے یہیں پہاڑ کے اس برفانی دامن میں تنہا چھوڑ کر تم چپکے سے آگے بڑھ جاؤ، جاؤ نینی ورنہ تم بھی میرے ساتھ اجل کا شکار ہو جاؤ گی، میری برف زدہ یاسیت سے تم بھی برف ہو جاؤ گی، جاؤ، وہ دیکھو ماؤنٹ ایورسٹ اپنا سر اٹھا اٹھا کر تمھاری راہ تک رہا ہے۔ جاؤ پلیز، جاؤ نا ـــــ !کیا ـــــ کیا تم واقعی جا رہی ہو نینا؟ ـــــ میرے دل کی دھڑکن سردی کے بوجھل احساس سے نہایت مدھم، اور مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ نہ جاؤ نینی، اب میں گھڑی بھر کا مہمان ہوں، ذرا اور ٹھہر جاؤ۔ میرا دایاں پہلو بھی سن ہو رہا ہے، سارا بدن برف کا تودہ بنتا جا رہا ہے۔ بس اب گھڑی دو گھڑی کی بات ہے۔ مجھے اپنی موت صاف نظر آ رہی ہے۔ ـــــ !میرے اوپر جھکی ہوئی، یہاں! اُفوہ! اس کا لمس کتنا ٹھنڈا ہے! ـــــ میرا دم اکھڑ چلا ہے نینی تو مجھے یہیں برفوں میں چھوڑ کر آگے ہو لینا تاکہ میں سدا کے لئے مرا رہوں، ایسا نہ ہو کہ تم میری لکڑیوں کی چتا بنا کے آگ کے سپرد کر دو تو حرارت محسوس کر کر کے میں از سرِ نو جی اٹھوں۔ مجھے زندگی سے ڈر لگتا ہے نینی، جینے سے بے حد ڈر لگتا ہے!

بچاؤ نینا! میں سچ مچ مر رہا ہوں، بچاؤ! ـــــ کوئی بھی میری آواز نہیں سن رہا۔ میرے آس پاس یہ اتنے سائے کیوں جمع ہیں؟ یہ سب لوگ کہاں ہیں جن کے یہ سائے ہیں؟ نینی کہاں ہے؟ نینی کہاں ہے؟ کیا مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے؟

نینی ـــــ نینا ـــــ نینی ـــــ ئی! ـــــ!

کئی بار کہا ہے اتنی آوازیں نہ دیا کرو!

نینی کا لہجہ بدلا ہوا کیوں ہے؟

تم گئیں نہیں؟

نہیں، لیکن چلی جاؤں گی۔

!؟

اب میں تنگ آ گئی ہوں، بے حد تنگ آ گئی ہوں۔ اب نہیں ٹھہروں گی۔

میرے خون کی ایک بہت بڑی لہر دائیں سے بائیں جانب اچھلی ہے۔

یہ تم کہہ رہی ہو؟ تم؟ ت —؟

میں نے گویا دھکا کھا کر تاریکی کے مرکزی نقطے کو چھو لیا ہے، موت کے عین پیٹ میں آگھسا ہوں، جہاں نور کا عالم ہے، اتنی روشنی کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا، کچھ سنائی نہیں دیتا۔ کچھ محسوس نہیں ہوتا۔

اب؟

ہاں، اب چل بسا ہے، دیکھو چہرہ مینوں سا بالکل خالی ہو گیا ہے۔

لیکن دفعتاً میں نے موت کے پیٹ سے جنم لے کر از سرِ نو آنکھ کھول لی ہے اور اپنے بالکل صحت مند، سالم وجود کو اٹھا کر آسانی سے بیٹھ گیا ہوں اور اپنی لاش کے ارد گرد بیٹھے ہوئے ہکا بکا لوگوں سے بڑی بے تابی سے پوچھا ہے۔ نینی کہاں ہے؟!

آغا بابر

رات والے

آج سے بیس برس پہلے کی بات ہے۔ اسحاق بی۔ اے کرنے کے بعد ایم۔ اے میں داخل ہو گیا اور اس کا ساتھی بدرالدین لا کالج میں۔ ظفر کے حالات نے ساتھ نہ دیا۔ وہ پینتیس ۳۵ روپے ماہوار پہ نوکر ہو گیا۔ اسحاق اور بدرالدین جب ظفر کو پینتیس روپلی کے لئے کولھو کے بیل کی طرح صبح سے شام تک کام کرتا دیکھتے تو سوچتے اگر وہ ایم۔ اے اور لا میں داخل نہ ہو جاتے تو ان کا بھی یہی حشر ہوتا۔

بدرالدین کی طبیعت میں قانون کی تعلیم نے انقلاب لانا شروع کر دیا۔ بات یہ ہوئی کہ جان محمد ملکی اس کا ہم جماعت تھا۔ جب ملکی دوستوں میں بیٹھ کر امیری کا فرق، ذی اقتدار لوگوں کا محتاجوں پہ جبر و تشدد اور سامراجی حکومت کی بے انصافیاں بیان کرتا اور بات بات پر انھیں بے نقط سناتا تو اس کے لہجے میں خلوص دل میں ہمدردی اور دماغ میں کچھ کر گزرنے کا جذبہ کروٹیں لیتا ہوا محسوس ہوتا اور سننے والے اس کے اظہار و بیان کی قوت سے مسحور ہو جاتے۔ ملکی کی باغیانہ باتیں اسحاق کو اپنے ہوسٹل سے کھینچ لاتیں۔ ملکی بولتا رہتا۔ بدرالدین اور اسحاق اپنی ہتھیلیوں پر ٹھوڑیاں رکھے پورا پورا تاثر قبول کرتے رہتے۔ ان کے سینوں میں بغاوت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر پیچ و تاب کھانے لگتا اور سماج کے سارے ڈھانچے کو بدل دینے کی خواہش سے رگِ جاں سلگنے لگتی۔

یہ عرصہ انھوں نے ایک عجیب روحانی کرب میں گزارا۔ صبح بہاراں کے پیچھے لاکھ چھپنے کے باوجود بھی شامِ خزاں اُن کی نگاہوں سے نہ چھپ سکتی۔ غریب انسانی برادری کے دکھ درد کا احساس ان کے دلوں میں روز بروز گہرا ہوتا گیا اور اس دکھ درد کو بانٹنے کی خواہش تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔

اسحاق نے ایم۔ اے کر لیا اور بدرالدین ایل ایل بی ہو گیا مگر چند ہی دنوں میں یہ حقیقت ان پر

آشکار ہوگئی کہ یہ ڈگری جس پر وہ اتنی آس لگائے بیٹھے تھے زندگی کی جدوجہد میں ان کے مسائل حل کرنے میں معاون ثابت نہیں ہو رہی۔ دنیا کی اگر ضرورت ہے تو ان کو ہے دنیا کو ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس تلخ احساس نے کھولنے والے لاوے میں کچھ اور آتش گیر مادہ لا اکٹھا کیا۔ ان میں یاس افسردگی اور بددلی پیدا ہونا شروع ہوگئی۔ طرح طرح کی تلخیوں سے ان کی زندگی میں بدمزگی پیدا ہونے لگی اور ان کے باغیانہ خیالات نکاس کی راہ تلاش کرنے کے لئے مچلنے لگے۔ انہی دنوں ملکی نے ان کی ملاقات خلیفہ جی سے کرائی۔ لوگ انھیں خلیفہ جی کہتے تھے۔ گورا چٹا رنگ، لباس قمیص پتلون، دوہرا ورزشی بدن، موٹی گردن، مڑے ہوئے کان، لمبی لمبی مونچھیں، سر پہ لنڈے بازار سے خریدی ہوئی گورکھا ہیٹ، دو خاکی فوجی تھیلے کمر پر اور ہاتھ میں شام چڑھی لاٹھی۔ عام طور پر خاموش رہتے اور ایک پروقار طریقے سے فاتح پہلوان کی طرح بازار سے گزرتے۔ دیسی کسرتی بدن پر ولائتی گورکھا ٹوپی اور پتلون میں پھنسی ہوئی معمر پہلوانی توند مگر کسی کے چہرے پر اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر مسکراہٹ نمودار تو ہو جائے۔ ڈبی بازار ہو یا انارکلی وہ اپنے تمکنت آمیز انداز میں گزر جاتے۔ اس جاندار شخصیت کے گرد خود اعتمادی نے ایک حصار باندھ رکھا تھا۔ "پترو ورزش کرو ورزش" نوجوانوں کو یہی تاکید کی جاتی۔

چنانچہ خلیفہ جی نے اپنی پرمعنی و پرجوش گفتگو میں ورزش اور نماز ہی پر زور دیا۔ ورزش سے جسم میں طاقت آتی ہے، اعضا کھلتے ہیں، نماز سے روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے اور قلب پر روحانی اسرار و رموز آشکار ہوتے ہیں۔ خود سر سے نہ اترے، تلوار کے دستہ پر ہاتھ رہے اور گھوڑے کی پیٹھ پر زین ہر وقت کسی رہے۔ نہ معلوم کب دشمن پر شب خون مارنا پڑ جائے۔

ایک ملاقات خلیفہ جی سے اور ہوئی کہ ظفر جو دفتر کا بابو بنتا چلا جا رہا تھا اس کے اندر دبی چنگاری کو ہوا دیتا ان کے ساتھ آملا۔ تینوں نے شہر کی گہما گہمی اور شہر کی ہاؤ ہو سے دور وسن پورہ میں ایک معمولی سا کچا مکان پانچ روپیہ ماہوار کرایہ پر لے لیا۔ نماز تو پانچ وقت پہلے بھی پڑھی جاتی تھی اب ورزش بھی باقاعدگی کے ساتھ ہونے لگی۔ کچھ عرصہ بعد ایک بھینس رکھ لی گئی جس کا دودھ وہ آپ ہی دوہتے اور دیکھ بھال بھی آپ ہی کرتے۔ ورزش کے بعد ایک دوسرے کی مالش کی جاتی۔ ہر ایک محسوس کرنے لگا کہ ان کے بدن میں اب ایک پھرتیلی لچک پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ بازوؤں اور رانوں کا ڈھلاؤ شروع

ہو گیا تھا۔ جسم میں قوت اور پنجوں میں گرفت اتر آئی تھی۔ خواہ مخواہ دو دو ہاتھ کرنے کو جی چاہنے لگتا تھا۔

جب شام کو بدر اور اسحاق دو سو روپیل گزر کر مہدی شاہ کے علاقہ میں سے گزرنے لگتے تو ان پر ایک اداسی سی چھا جاتی۔ اس سارے علاقے میں ایک غم انگیز غبار چھایا ہوا دکھائی دیتا جیسے خاک اڑ رہی ہو۔ ظفر کو یوں محسوس ہوتا کہ یہ ناکام اور مایوس دلوں کا دھواں ہے جو اس نیم مردہ آبادی پر اپنا کوئی انتقام لینے کے لئے پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ وسن پور دکی نیم روشن دکانیں نقاہت اور کمزوری سے اونگھتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ غریب لوگ چلتے پھرتے سائے دکھائی دیتے۔ یوں معلوم ہوتا کہ اس علاقہ میں ہوا چل نہیں رہی سسکیاں بھر رہی ہے۔ ہر چیز جیسے ایک راز کے بوجھ سے دبی جا رہی ہے۔ یہ راز سوسائٹی کی ناانصافی ہے۔ بدرالدین چاروں طرف دیکھتا ہوا سوچنے لگتا۔ اسحاق دل میں کہتا امیری غریبی کا فرق ہی یہ راز ہے جس نے اس غریب اور بے مایہ علاقہ کو سوگوار بنا رکھا ہے۔ ظفر سوچتا یہ راز ذی اقتدار لوگوں کا محتاجوں پر جبر و تشدد ہے۔ تنور والے کی دکان پیچھے رہ جاتی۔ تمباکو والا نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ بساطی اور کنجڑے کی دکان کی غمناکی محو ہونے لگتی۔ بائیسکل پگڈنڈیوں پر چلنے لگتی۔ زر و جواہر میں لپٹا ہوا مرصع و مسجع لاہور بہت پیچھے رہ جاتا۔ اب کھیت سامنے نظر آتے۔ لوسن اور شفتل کی بھینی بھینی خوشبو کو نتھنے محسوس کرتے۔ رہٹ کی طرف سے مویشیوں کے ڈکارنے کی آوازیں آتیں۔ سورج کی آخری کرنیں شفق کی پہنائیوں میں چند انگڑائیاں لے کر غروب ہو جاتیں۔ یہ کچے راستہ کو کاٹ کر پھر پگڈنڈی پر ہو لیتے۔ اپنے کچے کوٹھے میں آکر یوں محسوس کرتے جیسے قصرِ عافیت میں آن پہنچے۔

علی الصبح نماز پڑھنے کے بعد ڈنڑ پیلے جاتے اور لاٹھی چلائی جاتی۔ معصوم پتیوں پر خنک سویرا رقص کر رہا ہوتا کہ یہ مالش کے بعد کنوئیں کی طرف نہانے کے لئے چل کھڑے ہوتے۔ گاؤں کے سیدھے سادے لوگ ان کی خدمت کر کے خوش ہوتے اور یہ ان میں بیٹھ کر ان کا دکھ درد سنتے انھیں دلاسا دیتے عرضی پرچہ لکھنے کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی لکھ دیتے۔ لاٹ صاحب کے دفتر میں نوکر ہونے کی وجہ سے گاؤں میں ظفر کی ساکھ بیٹھ گئی اور ان تینوں نوجوانوں پہ گاؤں والوں کو بڑا مان ہونے لگا۔ لنگر لنگوٹ کس کر یہ گاؤں کے البیلوں سے کشتی لڑنے کے لئے اکھاڑے میں اتر جانے میں کوئی عار نہ سمجھتے۔ کلائی پکڑتے کبڈی کے لئے میدان میں نکل آتے۔ مٹی میں لوٹ پوٹ کر انھیں حجاب نہ آتا بلکہ کسی کمین گاہ سے ایک

لطیف سی سنسناہٹ نکل کر رگ و پے میں پیرتی ہوئی بچپن کی یاد دلا جاتی۔ اور وہ یوں محسوس کرنے لگتے جیسے وہ اپنی ماں کی آغوش میں لیٹے مچل رہے ہوں۔ کبڈی میں کسی کا بازو یا ٹانگ ظفر کے ہتھے چڑھ جاتی تو وہ ایسی کنڈلی مارتا کہ اس کی پکڑ سے نکلنا محال ہو جاتا اور گاؤں کے لڑکے اپنے آپ کو یہ کہنے پر مجبور پاتے کہ بابو دیکھنے میں سوکھا سڑا ہے مگر ہے بڑا کڑنگ۔

دور دور تک یہ تینوں دوڑ لگاتے۔ درختوں پر چڑھنے اترنے کی مشق کرتے۔ کپڑوں سمیت نہر میں کود جاتے۔ وہ گاؤں والوں کے ساتھ مل کر دو ایک لڑائیوں میں بھی شریک ہو چکے تھے۔ ان کے لئے نڈر اور بے خوف ہونا ضروری تھا۔

انہوں نے ایک دن کہا "خلیفہ جی اب ہم تیار ہیں"۔

خلیفہ جی نے ایک نگاہ تینوں پر ڈالی اور کہا "چلو آج ہی سہی۔ بھاٹی دروازے کا سلور سینما"۔

خلیفہ جی نے سگرٹ سلگالیا اور ایک منڈیر پر اکڑوں ہو کر جا بیٹھے۔ گور کھا بیٹ کھینچ کر ابروؤں تک سرکالی اور یہ دیکھنے کیلئے کہ وہ اپنے فرائض سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں ان پر کچھ اس طرح نظریں جما دیں جیسے کوئی جنگ آزما جرنیل کسی ٹیلے پر کھڑے ہو کر میدان جنگ کا نقشہ دیکھنے لگے۔

سینما والوں کو شک پڑ گیا کہ ان لڑکوں کی نیت میں فتور ہے۔ منیجر نے گیٹ کیپروں سے کہہ دیا جنہوں نے جا کر سینما کے غنڈوں کو چوکنا کر دیا۔ یونیورسٹی کے تین گریجوایٹ کچھ اس طرح آگے بڑھے جیسے ان کی ساری حسرتوں اور ناکامیوں کا واحد سبب یہ سینما ہال تھا جس کی وہ آج اینٹ سے اینٹ بجانے آگئے تھے گیٹ کیپر نے ٹکٹ مانگا ظفر نے انگلی کے اشارے سے پچھلے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے مانگا تو اس نے تیسرے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ گیٹ کیپر نے دونوں کو روک لیا۔ پیچھے سے بدرالدین تحکم سے بولا "کیوں روکتے ہو ٹکٹ ہمارے پاس ہیں"۔

گیٹ کیپر نے کہا "پہلے ٹکٹ دکھائیے"۔

"ہم کہتے ہیں مت روکو ٹکٹ ہم دیں گے"۔ بدرالدین بولا۔ مگر گیٹ کیپر ٹس سے مس نہ ہوا۔ بدرالدین نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ٹکٹ نکال کر گیٹ کیپر کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اس نے تینوں کو راستہ تو دے دیا مگر بدرالدین نے اسے گریبان سے پکڑ کر کہا "تو نے کیا سمجھ رکھا ہے ہمیں کہ بے ٹکٹے ہیں"۔ وہ کچھ کہنے ہی پایا

تھا کہ بدرالدین نے یہ زور کا جھانپڑ اس کے منہ پر دیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ گیٹ کیپر کے ساتھی اس کی مدد کو نکلے تو اس سے اسحاق اور ظفر جٹ گئے۔ دھما دھم گھونسے پڑنے لگے۔ کرسیاں چلنے لگیں۔ بڑے زور کا رن پڑا۔ مگر مجال ہے بدر، اسحاق یا ظفر کے منہ سے کوئی گالی گلوچ نکلا ہو۔ وہ بڑی خاموشی اور بھلمنسائی سے لڑتے رہے اور لڑتے لڑتے کہیں ادھر ادھر سے باہر نکل گئے۔

خلیفہ جی نے باغ میں آکر تینوں کی پیٹھ ٹھونکی اور مبارکباد دی۔

آزمائشی اور ابتدائی مرحلہ بخیر و خوبی طے پا گیا۔ انھیں اپنی طاقت اور کس بل کا علم ہو گیا اور خود اعتمادی کا جذبہ بڑھ گیا۔

نواحی علاقہ کے غریب اور نادار لوگوں کی فہرستیں پہلے ہی سے مرتب ہو چکی تھیں۔ خلیفہ جی کے پاس بھی کئی بیواؤں اور یتیموں کے پتے موجود تھے۔ اب امیروں اور متمول لوگوں سے مال متاع لے کر محتاجوں اور ضرورت مندوں کو دینا تھا۔ دولت والوں سے دولت چھیننے کا جو طریقہ ہوتا ہے وہی انھیں اختیار کرنا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جو راہ انھوں نے اختیار کی تھی وہ پر خطر ضرور تھی، مگر غیر متوقع خطرات سے دوچار ہونے کے لئے انھوں نے اپنے آپ کو ایک ٹھوس سانچے میں ڈھال لیا تھا۔

پہلی واردات جو انھوں نے کی اس کی حرارت اور رگ و پے کی سنسناہٹیں وہ ساری عمر محو نہ کر سکیں گے اور پھر نقدی کو غریب غربا میں تقسیم کر کے جو اطمینان قلب انھیں نصیب ہوتا رہا وہ کوئی بھول جانے کی چیز تھی۔ دو وارداتوں کا کامیاب نتیجہ اور ان لوگوں کا جذبۂ خلوص دیکھ کر ایک دن خلیفہ جی نے کہا "پترو تمھیں اب کام کرنے کا ڈھنگ آگیا ہے، اب تم بغیر میرے اشارے اور مدد کے کام کر سکتے ہو۔ وہ پروردگار تمھاری نیتوں سے واقف ہے۔ تمھارے کام میں وہی برکت ڈالے۔ کسرت کرتے رہنا پترو، کسرت نہ بھولنا۔"

اس دن کے بعد کبھی کبھار لاہور کی کسی سڑک پر خلیفہ جی سے ملاقات ہو جاتی تو ہو جاتی ورنہ ان تینوں دوستوں کی مصروفیت انھیں اجازت ہی کہاں دیتی تھی شہر کی طرف آنے کی۔ شہر سے نمٹ کر انھوں نے اب دیہات کی طرف پاؤں پسار لئے تھے۔

جس کسی خوشحال گھرانے میں شادی ہوتی ان کی نظریں دلہن کے مال پر لگی رہتیں۔ موقع جس رات

بھی ملتا اڑائے جاتے۔

بجھیل پانی کی طرح رات کی تاریکیوں میں اپنا شکار ڈھونڈنا اور حملہ کرتے وقت عجب عجب نوع کی سنسنی خیز کیفیتوں میں سے گزرنا اب زندگی کا جزو اعظم بن گیا تھا جیتنی ٹھیک دن کو طبیعتوں میں ہوتی اتنی وہ رات کو سنگین اور سخت ہو جاتیں۔ دل و دماغ عجب قسم کا مجرمانہ لبادہ اوڑھ لیتے۔ آنکھوں میں عقاب کی سی تیزی آجاتی اور پاؤں زمین پہ یوں بے آواز پڑتے جیسے روئی بھری ہو۔

تینوں اپنی اپنی جگہ ورزش کر رہے تھے۔ بدر الدین کا کسا ہوا بدن تھا۔ پتلی پتلی پنڈلیوں پر گدرائی ہوئی رانیں۔ پچکا ہوا پیٹ۔ اس کے اوپر پسلیوں پر کسی ہوئی کھال اور سینے کے درمیان سیاہ بالوں کے دائیں بائیں تھوڑا تھوڑا گوشت پھسل پھسل کر پھیلا سا ہوا یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے چکی کے دو پاٹ۔ گالوں کا گوشت کھنچا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں، بچھو کے ڈنک کی طرح اٹھی ہوئیں۔ بازوؤں کی مچھلیاں تھرکتی ہوئیں۔ اسحاق بھی بدر ہی کی طرح "چھیمکا" جوان تھا مگر قد میں لمبا تھا۔ خود دیوار پھاندنا یا سیڑھی بن کر ظفر اور بدر کو چھت پر چڑھانا اس کا کام تھا۔ کام شروع شروع میں بانٹے جاتے تھے، مگر اب تو طبیعتیں اتنی نڈر اور رواں ہو گئی تھیں کہ واردات کے وقت آپ ہی آپ کام طے پا جاتے۔

عشا کی نماز کے بعد تینوں نے آدھا آدھا گلاس دودھ کا دم کر کے پیا۔ اسحاق نے اپنے گلے میں ڈالے ہوئے تعویذ کو ہاتھوں میں لے کر ذرا ہلایا اور تینوں اپنی شام چڑھی لاٹھیاں لے کر باہر نکل آئے۔ مہاوٹیں پڑ رہی تھیں۔ چاند کبھی بادلوں کے نیچے گھر جاتا کبھی روشن ہو جاتا۔ چاروں طرف کھیت سوئے پڑے تھے۔ پیلو کے پرانے تنے کے نیچے سے جھینگر کے بولنے کی آواز آ رہی تھی جس سے رات کی خاموشی زیادہ شدید ہو رہی تھی۔ ظفر نے اپنی لاٹھی سے تنے پر ہلکی سی ضرب لگائی جس سے جھینگر خاموش ہو گیا۔ تینوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ گاؤں کی مسجد اور کچے مٹیالے کوٹھے رات کی تاریکی میں گھل مل گئے تھے۔ وہ گاؤں کی پگڈنڈی کاٹ کر الگ راستے پر ہو گئے۔

سامنے اللہ دین کا باغ تھا جس کی منڈیر کے ساتھ ساتھ چل کر وہ پنڈتوں کے گئو شالہ کے قریب آ نکلے۔ سرس اور شیشم کے پیڑ نیند میں اونگھ رہے تھے کیکر کے پھولوں کی سوندھی سوندھی خوشبو ان کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ اس کی ٹہنیاں بہت نیچے تک جھک آئی تھیں۔ ہوا کا ایک ٹھنڈا سا جھونکا جب ان کے بدنوں سے چھوتا ہوا گزر گیا تو انھوں نے اس کیکر کے نیچے کھڑے ہو کر ڈھاٹے باندھ لیے اور ایک دوسرے

کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا جیسے شکار کی بو آ گئی ہو۔ جب تکیہ کے قریب سے گزرنے لگے تو اسحاق نے بدرالدین کو بازو سے پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے منہ پر ڈال دیا اور کان میں آہستہ سے کہا "ادھر کتیا نے بچے دیے ہوئے ہیں"

گاؤں کی آبادی شروع ہو چکی تھی مگر انہیں شمال کی طرف سے جانا تھا، کیونکہ چودھریوں کے مکان کو وہ راستہ ان کے لیے زیادہ محفوظ تھا۔ انہوں نے لاٹھیوں کو بغلوں میں دبا لیا اور نہایت بے آواز قدموں سے گاؤں کا نصف چکر کاٹ کر شمال کی طرف مڑے۔ چاند بادلوں کے نیچے چھپ گیا تھا۔ انھوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ میدان صاف تھا۔ بدرالدین باہر کھڑا رہا۔ ظفر اسحاق کے کندھے پر بیٹھ کر دیوار پر چڑھ گیا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے اسحاق کو بھی اوپر کھینچ لیا۔ بدرالدین نے چاروں طرف دیکھ بھال کر جائزہ لیا اور دیوار پر آن چڑھا۔ وہ تینوں دیوار سے کوٹھے پر جا چڑھے۔ بڑا سا احاطہ تھا۔ اب وہ تین چھتوں پر سے ہوکر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور نچلی دیوار پر آن بیٹھے۔ دلہن یہیں بیاہ کر لائی گئی تھی۔ یہاں تینوں دیوار کے ساتھ جھکے ہوئے ہوا سونگھ رہے تھے۔ پھر بدرالدین نے پیٹ کے بل رینگ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی کہ ایک شخص پھاٹک کھول کر داخل ہوا۔ ان تینوں نے اپنے اپنے سر دیوار کے ساتھ لگا دیے۔ وہ شخص پیشاب کے لیے کونے میں بیٹھ گیا۔ بدرالدین نے سر سے اشارہ کیا اور دیوار پھاند کر جنگلی بلی کی طرح اس پر جھپٹا مگر وہ آدمی اس سے بھی پھرتیلا تھا۔ تیزی سے مڑا اور بدرالدین کے ہاتھوں کو اپنے منہ تک پہنچنے سے پہلے ہی جل دے گیا۔

بدرالدین نے دوسرا حملہ کیا۔ اس شخص نے دیوار کی طرف دیکھ کر کہا "اچھا دو اور بھی ہیں"

اس کی گردن کے گرد بدرالدین نے ہاتھوں کا حلقہ تنگ کرنا چاہا کہ وہ بولا "دیکھو آج میری شادی ہوئی ہے۔ میں نے ابھی دلہن کی صورت بھی نہیں دیکھی، وہ میری منتظر ہے۔ میں اسے ملنے جا رہا تھا۔ اگر دو دو ہاتھ دکھانے کا شوق ہے تو آج نہیں کل سہی۔ بلکہ کل میرا ولیمہ کھاؤ۔ پرسوں جس طرح تمھاری مرضی"

بدرالدین نے بے ساختہ گلے لگا کر اس کا منہ چوم لیا اور پھر دیوار پھاند کر غائب ہو گیا۔

اگلے روز تینوں ولیمہ کھانے جا پہنچے۔ دولہا نے نئی صورتیں دیکھ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور آہستہ سے رازدارانہ انداز میں پوچھا "رات والے؟"

جواب میں بدرالدین نے صرف اپنی بائیں آنکھ کو دبا دیا۔ اسحاق اور ظفر نے مسکرا کر دولہا کی طرف دیکھا جس کے بانکے بدن سے شعاعیں نکل رہی تھیں۔

زہرہ فاطمی

خدا بخش

خدا بخش۔ مجھے اس نام ہی سے چڑ ہے۔ جب معلوم ہوا کہ کوئی خدا بخش نام کے صاحب میرے ہم سفر ہوں گے تو دل بیٹھنے سا لگا۔ کراچی سے چٹا گانگ تک مہینے میں صرف ایک ہی جہاز جاتا تھا۔ کام بھی ایسا ضروری تھا کہ بغیر گئے چارہ نہیں اگر کوئی بھی صورت ممکن ہوتی تو میں خدا بخش صاحب کے ساتھ سفر نہ کرتا۔ کسی اور نام کا چاہے جیسا بھی آدمی ہوتا مجھے کوفت نہ ہوتی مگر اب کیا کیا جائے۔ خدا بخش کے ساتھ کراچی سے چٹا گانگ کا بحری سفر کرنا ہی پڑا اور وہ میرے ساتھ آٹھ دن رہے۔

جب میں جہاز پر پہنچا تو خدا بخش کا سامان کیبن میں پہنچ چکا تھا میں نے سامان پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ سوٹ کیسوں پر کئی لیبل لگے ہوئے تھے۔ ہینڈ بیگ کے اندر سے ایوننگ ان پیرس ہیر آئل کی شیشی جھانک رہی تھی۔ مجھے ان میں سے کوئی بھی چیز پسند نہ آئی۔

میں نے ابھی ٹائی کھولی تھی اور گلے کا بٹن کھول ہی رہا تھا کہ پیچھے سے ایک صاحب مسکراتے ہوئے داخل ہوئے۔ "مجھے خدا بخش کہتے ہیں۔ آپ کی تعریف؟"

اپنا تعارف کراتے ہوئے میں نے کہا۔ "اتفاق ہے کہ ہم اور آپ ہمسفر ہوئے۔"

"بالکل۔ ارے صاحب میں تو خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ میری تو خوشی کی انتہا نہ رہی جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ یو۔ پی کے ہیں۔"

"آپ بھی۔" یوں ہی میرے منہ سے نکل گیا۔

"تو کیا آپ مجھے پنجابی سمجھتے ہیں۔ ارے صاحب اس شلوار پر نہ جائیے۔ میں تو پکا یو۔ پی کا ہوں۔" اسے ثابت کرنے کے لئے خدا بخش یو۔ پی کے بہت سے شہروں کے نام اور وہاں آباد اپنے رشتہ داروں کو گنانے لگے۔

خدا بخش ٹھنگنے سے ہٹے کٹے آدمی تھے۔ کالی کالی رنگت، موٹی سی ناک اور چمکدار اندر کی طرف دھنسی ہوئی آنکھیں، بال گھنگریالے تھے، بولتے فراٹے سے تھے اور بات کرتے وقت ہاتھ پاؤں سلکہ سارا جسم ہلتا تھا۔

"آپ کی کیا خدمت کروں؟" وہ آرام سے بیٹھ گئے۔

میں انھیں دیکھ ہی رہا تھا کہ کوٹ کی جیب سے امریکن سگرٹ کا ایک پیکیٹ نکال کر میرے طرف بڑھے "شوق کیجیے۔"

"جی، شکریہ!"

"اچھا، تو آپ اس نعمت سے محروم ہیں۔"

وہ بہت باتونی آدمی تھا۔ دہلی، کلکتہ، بمبئی، کراچی نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتا تھا سینما، فلسفہ، سائنس، سیاست سے لے کر بازار کے بھاؤ تک ہر موضوع پر گفتگو کر سکتا تھا۔ میں بھی اپنے بستر پر بیٹھ گیا اور "فلم فیئر" نکال کر دیکھنے لگا۔ مجھے خدا بخش اور بھی بُرے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ بات کافی دیر تک ہو چکی اور فلم فیئر کی ورق گردانی کرنے لگا۔

"ذرا وہ تصویر تو دکھائیے گا؟"

اتنی دیر میں کئی صفحے اُلٹ چکا تھا۔

"یہ؟"

"نہیں نہیں۔ آگے الٹیے۔ ہاں۔ ہاں یہی۔ مدھو بالا کی ہے نا؟"

میں نے مدھو بالا کی تصویر والا صفحہ نکال کر رسالہ بڑھا دیا۔

"نہیں اپنے پاس ہی رکھیے۔ میں بمبئی میں مدھو بالا سے کئی بار ملا ہوں۔"

انھوں نے مدھو بالا سے اپنی ملاقات کا قصہ شروع کر دیا ادھر میری عجیب کیفیت کبھی غصہ آتا تھا اور کبھی اپنی بے بسی پر رونے کو جی چاہتا تھا۔

"اوہ۔ ساڑھے چھ ہو گئے"۔ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور جان چھڑانے کی نیت سے اٹھا۔ "ذرا دیکھ آؤں کھانے میں کیا دیر ہے؟"

"آپ فکر نہ کریں میں نے سب انتظام کرلیا ہے۔ ابھی بیرا کھانا لے کر آجاتا ہے"۔ ہمارا صرف کیبن ہی مشترک نہیں تھا بلکہ ان میں تین وقت کا کھانا بھی ایک ساتھ ہوتا تھا کیا مجال جو عرشہ پر ٹہل آؤں اور خدابخش صاحب ساتھ نہ ہوں۔ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا۔ میں جس قدر اخلاق برتتا وہ سمجھتے گئے کہ ان سے مل کر مجھے روحانی خوشی ہوتی ہے۔ پھر بھی وہ بہت ملنسار آدمی تھا۔ تین دن میں سارے جہاز کے لوگ اسے جان چکے تھے۔ طبعاً وہ بڑا خوش مزاج تھا۔ بات بات پر بحث چھیڑ دیتا تھا اور آخر تک اپنی بات پر اڑا رہتا تھا۔ ویسے اس کی معلومات عام آدمیوں سے کچھ بھی زیادہ۔ اس لیے جو بھی منہ لگتا اُسے اپنی بات منوا کے چھوڑتا۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جس میں خدابخش صاحب کو دخل نہ ہو۔

کولمبو کے قریب جہاز ذرا کچھ زیادہ ہلنے لگا۔ مجھے متلی شروع ہو گئی۔ خدابخش صاحب مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ہم لوگ ڈاکٹر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ خدابخش صاحب وقار صاحب سے کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ وقار صاحب بھی ایک جھکی آدمی۔ جب سے جہاز پر ان سے ملاقات ہوئی تھی یہ برابر خدابخش کی مخالفت کرتے۔ ان کی بحث طول ہوتی جارہی تھی۔

وقار صاحب کسٹم میں تھے اور دو سال ہوئے کراچی سے چاٹا گانگ تبدیل ہو کر گئے تھے۔ بھاری بھرکم آدمی تھے۔ جسم ریڈی میڈ کپڑوں میں کسا ہوا تھا۔ دو سال کی جدائی کے بعد کراچی سے بیگم کو لے کر چاٹا گانگ واپس جارہے تھے۔

مسز وقار واقعی بڑی خوبصورت اور بھولی بھالی معلوم ہوتی تھیں۔ ان کا رکھ رکھاؤ بڑا پیارا تھا بڑی موہنی سی صورت تھی۔ بے اختیار دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔

ایک شام کو کامن روم میں بیٹھے بیٹھے موتیوں کی بات چل پڑی۔ جاپان نے نقلی موتی بنانے شروع کر دیئے تھے۔ ایک صاحب کا کہنا تھا کہ ان نقلی موتیوں سے اصلی موتیوں کی وقعت گر جائیگی۔ جاپان بڑے شاندار موتی تیار کرتا ہے اور کچھ دنوں میں اصلی کو بھی مات کرنے لگے گا۔ خدابخش صاحب کو تو ایسا موقع اللہ دے۔ انھوں نے موتیوں کے متعلق ہماری معلومات میں کافی اضافہ کیا۔ وقار صاحب ویسے تو موتیوں کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے مگر خدابخش کے مقابلے میں چپ کیسے رہتے۔ بول پڑے۔

اور ان کا ہونا تھا کہ بات بڑھتی چلی گئی۔ نہ جانے وقار صاحب نے کیا کہا کہ خدا بخش کو طیش آگیا۔ زور سے میز پر ہاتھ مارا اور دہاڑتے ہوئے بولے۔" میں بغیر کسی وثوق کے کوئی بات نہیں کرتا۔ میں خود موتیوں کی تجارت کرتا ہوں۔ موتیوں کے متعلق آپ لوگوں میں سے کوئی مجھ سے بہتر نہیں جانتا۔"

مجھے ابھی تک نہ معلوم ہو سکا تھا کہ خدا بخش صاحب کرتے کیا ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ ہیرے جواہرات کے تاجر ہیں اور کئی شہروں میں ان کی دوکانیں ہیں۔ اس وقت چٹاگانگ میں اپنی دکان کو دیکھنے جا رہے ہیں۔

"کیسا بھی نقلی موتی ہو میں ایک نظر میں بتا دوں گا۔" خدا بخش صاحب نے فاتحانہ انداز میں سب کی طرف دیکھا اور یکایک مسز وقار کے گلے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔" مثال کے طور پر مسز وقار کے گلے میں جو ہار ہے وہ موتی بالکل اصلی ہیں۔"

مسز وقار جھینپ سی گئیں اور اپنا ہار بلاؤز کے اندر چھپانے لگیں۔ وقار صاحب مسکرائے "تو یہ ہار اصلی ہے۔"

"بالکل۔ میں تو پہلی ہی نظر میں تاڑ گیا تھا۔" خدا بخش صاحب بولے۔

"میں نے خود تو یہ ہار نہیں خریدا۔ پھر بھی آپ بتائیے کیا قیمت ہوگی؟"

"کچھ نہیں تو پانچسو اور اگر الفسٹن سے لیا جائے تو آٹھ سو سے کم نہ لگیں گے۔"

"آپ کو تعجب ہوگا کہ مسز نے یہ ہار صرف اٹھارہ روپیہ میں خریدا ہے اور وہ بھی کراچی میں چلنے سے ایک دن پہلے۔"

"میں نہیں مان سکتا یہ بالکل اصلی ہے۔ میں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتا۔"

"چلو شرط۔ میں ایک ہزار دوں گا اگر یہ نقلی نہ نکلے۔"

"منظور!"

"اس میں شرط لگانے کی کیا بات ہے۔" مسز وقار نے دھیرے سے کہا۔

"کیوں نہیں۔ جب مجھے پتہ ہے کہ میں ہی جیتوں گا تو ہرج کیا ہے۔"

"مگر اصلی یا نقلی کا پتہ کیسے چلے گا؟" مسز وقار نے پوچھا۔" یہ تو میں نے ہی آپ کو بتایا تھا۔"

"ذرا مجھے تو دیجئے۔ ایک منٹ میں دیکھ کر میں بتائے دیتا ہوں۔ اگر نقلی ہوا تو میں خود ہی ایک ہزار دے دوں گا۔" خدا بخش نے کہا

"اتار نا دیر۔ آپ دیکھ ہی لیں"۔

مسز وقار کچھ کسمسائیں۔ دونوں ہاتھوں کو گردن پر رکھ کر ہار چھپالیا۔

وقار صاحب کھڑے ہو گئے۔ "میں اتار دیتا ہوں"۔

خدا بخش صاحب ہار ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ ان کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ انھوں نے ہار واپس کر دیا۔ یکایک مسز وقار کے چہرے پر نگاہ پڑ گئی۔ مسز وقار بالکل زرد ہو گئی تھیں۔ جیسے ابھی بیہوش ہو جائیں گی۔ وہ خدا بخش کو بڑی خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں جن میں بڑی لجاجت اور پُر درد رحم کی اپیل تھی۔ خدا بخش کچھ کہنے لگے تھے کہ منہ کھول کر رہ گئے۔

بڑی کوشش کے بعد انھوں نے کہا۔

"میرا خیال غلط نکلا۔ واقعی خوب نقل ہے ٹھیک ہے۔ اٹھارہ روپے ہی اس کی قیمت ہوگی"۔ انھوں نے جیب سے پرس نکالا اور سو سو کے دس نوٹ نکال کر وقار صاحب کو تھما دیئے۔

"اب آپ ہر بات میں ٹانگ نہ اڑائیں گے؟" وقار صاحب نے روپے لیتے ہوئے کہا۔

خدا بخش نے آنکھیں جھکالیں ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے

جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ یہ بات سارے جہاز پر پھیل گئی۔ خدا بخش سے لوگ بڑے اوٹ پٹانگ سوال کرتے۔ بہت سے لوگ خوش تھے کہ اچھا ہوا خوب ٹھگے۔ مسز وقار نے اس کے بعد سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ جب پوچھتے یہی جواب ملتا کہ سر میں درد ہے جہاز جنا کانگ پہنچنے والا تھا۔ دوسرے دن صبح ہمارا سفر ختم ہونے والا تھا۔ سویرے سویرے اٹھا اور جلدی جلدی شیو کرنے لگا۔ خدا بخش بستر پر لیٹے لیٹے سگریٹ پی رہے تھے مجھے دروازے کے قریب ایک لفافہ پڑا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے لفافہ اٹھا کر دروازہ کھولا مگر راہ داری خالی

تھی۔ لفافہ پر خدا بخش کا نام لکھا تھا۔ میں نے ان کی طرف بڑھا دیا۔

انھوں نے لفافہ کھولا۔ مگر اس میں خط نہیں تھا بلکہ سو سو روپے کے دس نوٹ تھے انھوں نے میری طرف دیکھا اور ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ لفافہ پھاڑ ڈالا اور میری طرف بڑھا دیا۔

"اس سوراخ سے باہر پھینک دیجیے۔"

میں نے لفافہ کے ٹکڑے باہر سمندر میں پھینک دیئے اور خدا بخش کو دیکھنے لگا۔

"کوئی جان بوجھ کے تھوڑا ہی بیوقوف بن سکتا ہے" وہ بڑبڑائے۔

"تو کیا وہ ہار اصلی تھا؟"

"کیا تم اپنی خوبصورت بیوی کو دو سال کے لئے کراچی میں چھوڑ سکتے ہو جب کہ خود چٹاگانگ میں رہو؟" انھوں نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

اس وقت خدا بخش مجھے بہت بھلے آدمی معلوم ہوئے۔ انھوں نے اپنا پرس نکالا اور نوٹ پھر رکھ لئے۔

حفیظ رومانی

بیگم باجی

بیگم باجی نے نجمی کی طرف رازدارانہ انداز سے دیکھ کر کہا "میں جا رہی ہوں"۔
نجمی نے گھبرا کر پوچھا "اور میں؟"
بیگم باجی نے جواب دیا "تم بھی جاؤ، لیکن میں رات بھر باہر رہوں گی"۔
نجمی بیگم باجی کی اکلوتی بیٹی تھی، نجمی کی عمر کوئی اٹھارہ کے لگ بھگ ہوگی، شکل وصورت اور عادات کے لحاظ سے نجمی بیگم باجی کی ہو بہو کاپی تھی، بیگم باجی کا بھی اس عمر میں اسی طرح کا گول مٹول جسم، لمبا قد اور چینیوں جیسے خدوخال تھے، جوانتے خوبصورت تو نہ تھے، لیکن چہرہ میں ملاحیت بہت زیادہ تھی اسکی غلافی آنکھوں میں شوخی اور حجاب ہر وقت آنکھ مچولی کھیلتے نظر آتے تھے۔ نجمی کی طرف دیکھیں تو سب سے پہلے اس کے سینے پر نظر پڑتی تو محسوس ہوتا، دو کچے ناریل اس نے اپنی چست قمیص میں چھپا رکھے ہیں۔ اس کے روئیں روئیں میں جذبات کا تلاطم اور جوش تھا۔ باجی شباب کی ایک تیز رفتار پہاڑی ندی تھی جو بڑے بڑے پتھروں کو اپنے مقام سے اٹھا کر کہیں سے کہیں پٹخ دیتی ہے۔

بیگم باجی کی زندگی شروع سے اب تک ایک گوناگوں دلچسپیوں کی کتاب تھی، جب وہ بچی تھی تو اس میں ایک عجیب بات تھی، اسے ہر چیز سے لپٹنے کا شوق تھا۔ وہ لحافوں سے لپٹتی، تکیوں سے لپٹتی، ابا اور امی سے، آنے جانے والوں، ماماؤں اور نوکروں سے لپٹتی۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو اسے بجائے لپٹنے کے لپٹانے میں مزا آنے لگا۔ اسے جو چیز نظر آتی وہ اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیتی۔ نہ جانے اسے اس طرح کیا تسکین ملتی؟ یہ زمانہ بھی ختم ہوا

تو وہ اب ہر ایک سے حجاب سا محسوس کرنے لگی۔ وہ جن سے لپٹتی رہتی یا جن کو اپنے سے لپٹاتی رہتی تھی ان سے جھینپنے اور چھپنے لگی، حالانکہ وہ اپنے دل ہی دل میں ایک نامعلوم جذبے سے متاثر ان سب سے محبت کرنے کے لئے ہمک رہی تھی۔ اسے اپنے اردگرد کی چیزیں حسین معلوم ہونے لگی تھیں۔ جب وہ عریاں ہو کر نہاتی تو پانی کے ٹب میں اپنے ننگے اور سڈول جسم کے خفیہ زاویوں کو پہروں دیکھتی اور انھیں دیکھ دیکھ کر اس کا جسم گرم ہونے لگتا۔ چنانچہ اُسے ٹھنڈا پانی اپنے جسم پر ڈالنے میں بڑا مزہ آتا۔ جب وہ رات کو سوتی تو اُسے بڑے رنگین خواب نظر آتے وہ ان خوابوں کو بار بار دیکھنا چاہتی اور اگر وہ جاگ جاتی تو وہ دوبارہ آنکھیں بند کر لیتی اور لیٹی رہتی تاکہ وہ وہی خواب مسلسل دیکھتی چلی جائے اور یہ خواب کبھی ختم نہ ہو، وہ ان خوابوں سے متاثر ہو کر کسی سے محبت کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی وہ کس سے محبت کرے، وہ سہم جاتی جب لوگوں کو یہ کہتے سنتی کہ عورت اپنی زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔ اس کے اردگرد کئی ایک گھومتے رہتے تھے اور سب کے سب اسے اپنی طرف کھینچنا چاہتے تھے، ان نوجوان کی حالت ایسی تھی جیسے جوانی کے تپتے ہوئے صحرا میں جنسی بگولے اڑ رہے ہوں۔ بیگم باجی نے ان بگولوں سے بہت بچنے کی کوشش کی لیکن آخر ان کی لپیٹ میں آ ہی گئی۔ شاکر ایک خوبرو نوجوان تھا اور باجی ایک الہڑ لڑکی۔ کچھ دنوں کے میل ملاقات نے باجی کو دیوانہ بنا دیا اس نے شاکر کو اپنے دل کے کعبہ میں بٹھا کر اس کی پرستش دن رات شروع کر دی اور اس پرستش کی کثرت کا نتیجہ نجمی کی ولادت تھی چنانچہ ولادت کے آٹھ مہینے پہلے دونوں کی شادی ہو گئی۔ نجمی کی پیدائش کے فوراً بعد شاکر کا باجی سے دل بھر گیا اور باجی سے دور دور رہنے لگا۔ جب تک باجی اس کی لپیٹ میں رہی وہ اس کے اردگرد چکر لگاتا رہا، اور جب اس کی لپیٹ میں نہ رہی تو خس و خاشاک کی طرح اسے پیچھے چھوڑ کر یہ جنسی بگولا آگے نکل گیا۔

شاکر کی علٰحدگی کے بعد، شاکر کے ملنے جلنے والے، جو باجی سے کئی بہانوں سے ملا کرتے تھے، اب باجی سے براہ راست ملنے لگے، بلکہ باجی نے خود انھیں جرأت دلائی، وہ ان کی

دعوتیں قبول کرتی اور ان ہوٹلوں ریستورانوں میں ان سے ملتی جہاں کھانا پینا کم ہوتا ہے، ملنا ملانا زیادہ چنانچہ باجی چند دنوں میں ہی ان سب سے گھل مل گئی۔ باجی اپنے ملاقاتیوں سے ملنے کے لئے نئے نئے انداز وں سے سنگار کرتی وہ اپنے لمبے لمبے بالوں کو اس طرح اٹھا کر ایک ربن سے باندھ کر پیچھے چھوڑ دیتی جیسے ایک چاق چوبند گرم گھوڑی کی دم اٹھی ہوئی ہو، اسی طرح وہ اپنی باڈی کے ڈوروں کو اتنا کس کر باندھتی کہ اس کے پہلوؤں کا نرم نرم گوشت اس طرح باڈی کے کناروں سے نکل جاتا جیسے تلچھوں کے سخت خمیر کے پیڑے کو مٹھی میں لیکر زور سے بھینچ دیا جائے۔ وہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر ایک زعم کے ساتھ باہر نکلتی اور وہ جس طرح چاہتی اور جو چاہتی تھی اپنے چاہنے والوں سے کرواتی تھی۔ باجی کے ملنے والوں کے لمبے لمبے کیو لگے رہتے تھے اور باجی ہر ایک کو خوش کر دیتی تھی، ہر ایک کی بات مانتی تھی اور کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتی تھی۔ شہر میں جہاں بھی کوئی تقریب، جلوس یا جلسہ ہوتا باجی کو سب سے پہلے بلایا جاتا اور باجی ہر جگہ پیش پیش نظر آتی۔

اُصولی طور پر مرد اور عورت کو کبھی برابر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ وہ وہموں اور خوف کا شکار بنی رہے تو اچھا ہے اُسے اپنے آپ اور اپنے ملنے جلنے والوں سے خوف آتا ہو تو وہ صحیح عورت ہے، اگر اس کا یہ خوف مٹ جائے اور واہمے دور ہو جائیں تو پھر یہ صرف ایک جسم رہ جاتی ہے جس میں جنس ہی جنس بھری ہوتی ہے۔ اس جسم کو مرد نوچتے ہیں کتوں کی طرح لے کر بھاگتے ہیں، اس نوچا ناچی اور بھاگم دوڑ میں بیچاری عورت کو کئی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ پہلے پہل تو وہ ان ٹھوکروں میں اذیت محسوس کرتی ہے لیکن پھر اسے آہستہ آہستہ لذت حاصل ہونے لگتی ہے۔ اور آخر کار ایک ایسا وقت آتا ہے وہ ان ٹھوکروں کے لئے بے حس ہو جاتی ہے گو باجی کا خوف اتر چکا تھا اور واہمے دور ہو چکے تھے لیکن باجی کو اپنے جسم کی نوچا نوچی میں نہ تو کوئی لذت حاصل ہو رہی تھی اور نہ ہی وہ اس اذیت سے بے حس ہو گئی تھی بلکہ وہ سوچتی رہتی تھی وہ کیا بنتی جا رہی ہے؟ وہ کیا کر رہی ہے؟

اس کی سہیلیوں نے اس سے کہنا شروع کر دیا باجی مردوں سے ذرا تن کر ملا کرو لیکن

باجی کا خیال تھا اگر مردوں سے ملنا ہی ہے تو پھر تن کر ملا جائے یا جھک کر کیا فرق پڑتا ہے. باجی منطق اور فلسفہ کی جھال دے کر باتیں ایسے انداز میں کرتی کہ اس کی سہیلیاں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتیں، باجی کی تعلیم اور مطالعہ سے مذاق سلجھا ہوا تھا. طبیعت میں بلا کی اڑان انداز رنگین اور بات کرنے میں جرأت تھی، وہ خوب سمجھتی تھی مرد عورتوں سے کیا کچھ چاہتے ہیں اور عورتوں کو کیا کرنا چاہیئے. چنانچہ وہ اسی طرح کا سنگار کرتی جیسا اس کے ملنے والے پسند کرتے، وہ ویسا ہی لباس پہنتی جیسا لباس اس کے چاہنے والے دیکھ کر خوش ہوتے، باجی کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا یہی ایک راز تھا وہ مردوں میں بہت ہوشمند مانی جاتی تھی وہ کسی کو ناراض ہونے کا موقع نہ دیتی تھی. وہ کسی کو فریب دینا گناہ سمجھتی تھی، وہ خود تکلیف اُٹھا کر دوسروں کو فائدہ پہنچانا چاہتی تھی، وہ کہا کرتی اچھے لوگ وہ ہوتے ہیں جو خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو فائدہ پہنچائیں. اس نے دوسروں کے غموں کے اندھیروں کو دور کرنے کے لئے اپنی زندگی کی موم بتی کو دونوں سروں سے روشن کر رکھا تھا' وہ چکا چوندھ پیدا کر رہی تھی، لیکن ہر نئے دن وہ گھٹتی جا رہی تھی' چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک جوان لڑکی "بیگم باجی" کہلانے لگی، اس کے سر کے بال کھچڑی نظر آنے لگے، اس کی گٹھی ہوئی ٹھوڑی پت پتی سی بن گئی، اس کی آنکھوں کے غلاف ڈھیلے ہو گئے اور ان میں سلوٹیں پڑ گئیں، اس کی زندگی ایک درد اور گھٹی گھٹی سی آہ بن کر رہ گئی تھی اس کے رونگٹے رونگٹے میں جو جذبات کے شعلے بھڑکا کرتے تھے ایک ٹھنڈی آگ میں تبدیل ہو گئے. لیکن یہ اس کے لئے جہنم کی آگ سے زیادہ عذاب دہ ثابت ہو رہی تھی وہ باہر جاتی تو اب پہلی سی بات نہ تھی، اس کے کچھ زعم ٹوٹنے لگے تھے.

اُسے احساس ہوا وہ عورت نہیں ماں ہے، اس نے اپنی ذمہ داریوں کا جائزہ لیا، اُسے یہ معلوم کر کے صدمہ ہوا نجمی بالکل اس کے نقش قدم پر چل رہی ہے. وہ سخت گھبرائی کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ ایک بیل دوسری بیل کو دیکھ کر پھیلتی ہے. وہ نجمی کے متعلق بہت محتاط ہو گئی اور نجمی کے غم میں صبح شام گھلنے لگی اور ہمیشہ اُداس نظر آنے لگی. بیگم باجی کو نجمی نے ایک بہت بڑا جھٹکا دیا اور وہ ایسا محسوس کرتی اس کی آزادی چھن گئی ہے، اس کے گھونے

پھرنے پر پابندیاں لگ گئی ہیں وہ کبھی کبھی بہت گھبرا جاتی اور چاہتی اپنی ٹھنڈی آگ پر تیل ڈال کر پھر سے شعلے بلند کرے لیکن نجمی کا خیال آتے ہی وہ برف کی سلوں کے نیچے دب جاتی اور یہ ٹھنڈی آگ برف سے دب کر اور زیادہ شدید ہوجاتی۔

بیگم باجی یوں تو کسی نہ کسی فکر میں ڈوبی رہتی۔ لیکن آج وہ بہت زیادہ پریشان نظر آرہی تھی کیونکہ آج نجمی نے کھل کر بیگم باجی سے باتیں کی تھیں بیگم باجی کانپ گئی کہ نجمی کے لچھن ٹھیک نہیں اس نے بڑی ملائمیت سے نجمی کو سمجھایا کہ وہ جو کچھ وہ محبت کے متعلق بتا رہی ہے وہ پہلے زمانہ کی باتیں ہیں۔ اب یہ باتیں صرف افسانوں اور کہانیوں میں رہ گئی ہیں لیکن نجمی نے بگڑ کر جواب دیا "باجی! آپ نہیں سمجھتیں وہ مجھے بیحد چاہتا ہے"

"یہ محبت صرف اس وقت تک ہے جب تک وہ شخص مل نہیں جاتا۔" باجی نے کہا۔ "محبت اس درد کا نام ہے، جو کسی چیز کے نہ ملنے سے ہم اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں، جب وہ ہمیں مل جاتی ہے تو ہمارے دل کا درد بھی مٹ جاتا ہے۔"

نجمی نے جھنجھلا کر کہا۔ "باجی! وہ میری کائنات پر چھایا ہوا ہے اور چھایا رہے گا۔ میں اسے ایک بار ضرور ملوں گی ایک بار ضرور!"

بیگم باجی سہم گئی، اس کو وہ اپنی پہلی ملاقات یاد آگئی جب وہ چند منٹوں کے لئے چوری اپنی کوٹھی کے پچھواڑے انجیر کے درخت کے نیچے ملے تھے اور ملتے ہی ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر ایک دوسرے کے گلے سے لپٹ گئے تھے انھوں نے جلتے جلتے ہونٹ ایک دوسرے ہونٹوں پر رکھ دیئے تھے اور لمس طویل میں کھو گئے تھے۔ بیگم باجی کو ذرا ہوش آیا تو وہ تھر تھر کانپنے لگی تھی، اس نے شاکر کو سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ تنہائی میں بہت نڈر ہوچکا تھا اور باجی اس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ایک گلہری سی بن گئی تھی جو سہمی ہوئی آنکھیں کھولے دیکھ رہی ہو اور کوئی مسلسل اس کے جسم پر پیار سے ہاتھ پھیرنے میں مشغول ہو! بیگم باجی نے تہیہ کر لیا وہ نجمی کو سختی سے کہے گی وہ ملنا ملانا سب بکواس سمجھتی ہے۔ اور اسے کبھی بھی باہر جانے کی اجازت نہ دے گی۔

چنانچہ باجی نے یک لخت اپنا رویہ بدل لیا اس کی باتوں میں سنجیدگی اور متانت آگئی اور

نجمی پر کچھ پابندیاں عاید کرنے لگی لیکن جو پابندی نجمی پر عائد کرتی وہی پابندی اس کے اپنے لئے سوہان روح ثابت ہونے لگی اور وہ سُست سُست رہنے لگی، ایک رواں ندی کا بہاؤ اگر سست ہو جائے تو اس میں بند لگا کر ٹھوکر پیدا کرتے ہیں اس طرح پانی زیادہ تیزی سے بہنے لگتا ہے۔ بیگم باجی کی زندگی میں بھی یہ پابندیاں ٹھوکر پیدا کر رہی تھیں اس کے دماغ میں نئے فتنے کروٹیں لے رہے تھے وہ اپنے ملنے جلنے والوں سے کچھ اس طرح پیچھے ہٹی تھی کہ ملنے جلنے والوں کے دلوں میں بڑھ کر دوبارہ دیکھنے کی تڑپ پیدا ہو رہی تھی بات کچھ بھی نہیں تھی لیکن اگر نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو بیگم باجی کی زندگی کسی ہنگامہ کا انتظار کر رہی تھی۔

ایک دن نجمی بیگم باجی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ دونوں خاموش تھیں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی نجمی نے جھٹ سے رسیور اٹھایا اور ٹیلیفون سنا یہ ٹیلیفون نجمی کے دوست کا تھا نجمی نے بیگم باجی کی طرف لجاجت سے دیکھا لیکن باجی نے تیور بدل لئے وہ غصہ سے لال پیلی ہو گئی لیکن نجمی پر اس کی نصیحتوں کا کچھ اثر نہیں ہوا وہ بہت بگڑی اور نجمی کو زوردار الفاظ میں سمجھانے لگی۔ پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، باجی نے غصہ سے رسیور اٹھایا بیگم باجی نے کڑک کر کہا۔ "کون؟" کچھ جواب ملا ایک دو باتیں ہوئیں، نجمی گھبرا رہی تھی۔ بیگم باجی نے آخری فقرہ یوں ختم کیا کہ وہ پہنچ رہی ہے۔ اور ٹیلیفون بند کر دیا بیگم باجی نجمی کی طرف بغور دیکھ رہی تھی؛ یہ ٹیلیفون شاکر کا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں دوبارہ آنا چاہتا تھا۔ بیگم باجی کا کھاری بھر کم گوشت ڈھیلا جذبات کی گرمی سے اُبال کھا کر سکڑنے لگا ایسا معلوم ہوتا تھا کسی نے اس کی ٹھنڈی آگ پر تیل چھڑک کر پھر جذبات کے شعلے بھڑکا دیئے ہیں، اس کا دل دھڑکنے لگا، چہرہ نکھر گیا، آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی اور جسم کا رواں رواں شاکر کا وظیفہ پڑھنے لگا وہ محسوس کر رہی تھی وہ پھر سے بیگم باجی سے 'باجی' بن گئی ہے جس کی زندگی ایک گھما گھمی تھی۔

بیگم باجی نے نجمی کی طرف رازدارانہ انداز سے دیکھکر کہا۔ "میں جا رہی ہوں"۔

نجمی نے گھبرا کر پوچھا۔ "اور میں؟"

بیگم باجی نے جواب دیا۔ "تم بھی جاؤ لیکن میں رات بھر باہر رہوں گی!"

قیصر تمکین

ماہِ عسل

میں ابھی بستر ہی میں تھا کہ کمرے کے باہر برآمدے میں کچھ آہٹ ہوئی۔ پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اپنے بازو کی طرف دیکھا نسیمہ غالباً بہت سویرے اُٹھ چکی تھی اور اب غسل خانے میں تھی۔ مجبوراً مجھی کو اٹھنا پڑا۔ دروازے پر ایک کم عمر نوجوان، بلکہ لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ مجھے حیرت رہی ہوئی۔ یہ کون ہے، پھر میں نے اس کو اندر بلا لیا اور سگریٹ پیش کر کے اس کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔

وہ قدرے پس و پیش میں تھا اور سگریٹ قبول کرتے ہوئے بھی ہچکچا رہا تھا۔ اسکی خاموشی اور گھبراہٹ سے مجھ کو اس کا پورا جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ اکیس بائیس برس رہی ہوگی۔ چہرہ بہت ہی دل کش بلکہ انتہائی خوبصورت تھا۔ اس کے کوٹ پر ٹائی نہیں لگی تھی بلکہ گردن میں اونی مفلر اس طرح لپٹا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا تھا وہ ابھی کھیل کے میدان سے واپس لوٹا ہے۔

"میرا نام سنکر ہے، وجے سنکر" وہ کچھ کچھ شرمندہ اور گھبرایا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ "بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر — آپ کیا پئیں گے چائے یا کافی؟"

مگر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بچے کو مٹھائی چراتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔ وہ نسیمہ کو دیکھکر گھبرا گیا تھا۔ میری نظریں بھی نسیمہ کی طرف اُٹھ گئیں، وہ اسوقت واقعی انتہائی دل کش معلوم ہو رہی تھی۔ نہانے کے بعد ہلکا سا میک اَپ کر کے لیڈی چسٹر کوٹ میں ملفوف وہ سامان آرائش کی دوکانوں کا ماڈل معلوم ہو رہی تھی مگر اس کے ماتھے پر تیوریاں

تھیں۔ غالباً وہ ایک اجنبی کو اپنے کمرے میں دیکھ کر غصہ ہو گئی تھی کیونکہ کمرے میں سارا سامان انتہائی بھونڈے پن سے بکھرا ہوا تھا۔

"میں چلتا ہوں۔ پھر ملوں گا" وہ بہت ہی گڑبڑ میں یہ الفاظ کہہ کر چلدیا اور میں صرف دروازے کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

"یہ کون تھا، کیوں آیا تھا ——؟" اپنی خفگی چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے نسیمہ نے پوچھا اور میں نے اپنی حیرت اور لاعلمی کا اظہار کیا۔

"یہ بدمعاش ہے۔ کل رات کو ڈائننگ ہال میں برابر مجھ کو گھورے جارہا تھا اور صبح بھی اس نے گالف کلب سے ہوٹل تک میرا پیچھا کیا"

"مبارک ہو۔ آپ کے پروانے یہاں بھی آپہنچے۔ مگر بھئی میں کسی سے خواہ مخواہ کی ڈوئل نہیں لڑنا چاہتا ہوں"

"میں خود صورت حال سے نپٹ لوں گی" وہ بدستور خفگی سے بولی۔

جب ہم اپنے کمرے سے نیچے آئے اور ڈائننگ ہال میں ناشتہ کی میز پر بیٹھے تو نسیمہ قدرے شگفتہ ہو چکی تھی۔ میں بھی بظاہر لاپروائی سے سگریٹ پینے میں مصروف تھا مگر خیال برابر اس خوبصورت لڑکے کی طرف تھا۔ اگر نسیمہ کا کہنا درست تھا کہ وہ بدمعاش تھا (اس کے چہرے سے انتہائی شرافت برستی تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے گھرانے سے اس کا تعلق تھا) تو وہ اتنا جری کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے کمرے میں مجھ سے ملاقات کرنے آپہنچتا۔

جب ہم خچروں پر سوار ہو کر کھلّن مرگ کی طرف چلے تو مجھ کو اس کی ایک جھلک دکھائی دی، وہ نیچے گالف کورس کی طرف سے مڑ کر جانے والی سڑک پر آہستہ آہستہ جارہا تھا۔

دن بھر کی تفریحات اور برف پوش پہاڑوں کے دامن میں نسیمہ کے ساتھ گھومتے اور ادھر اُدھر باتیں کرتے وقت مجھے اس کا بالکل خیال نہیں آیا۔ دن بھر کی تھکن سے چور ہو کر

نسیمہ کمرے میں پہنچتے ہی سو گئی اور میں اکیلا ڈائننگ ہال میں کھانے کے لئے چلا گیا۔ وہاں جب ہجوم کچھ کم ہوا اور کافی پینے کو میں اکیلا رہ گیا تو نہ جانے کہاں سے وہی لڑکا میرے پاس آگیا۔ وہ میری اجازت لئے بغیر میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔ میں نے کچھ بُرا ماننے کی کوشش کی مگر اس کا دلکش چہرہ دیکھ کر یہی جی چاہا کہ اس سے باتیں کی جائیں۔

"آپ کی وائف کھانے کی میز پر نہیں آئیں۔" اس نے بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا۔

"کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟" بہت ہی بے اختیاری طور پر میرا لہجہ ذرا تیز ہو گیا۔

"نہیں۔ مگر میں ان کو بہت پسند کرتا ہوں۔" یہ جملہ اس نے بیباکی سے کہنے کے لئے انگریزی کا سہارا لیا۔

میں کچھ عجیب سناٹے میں آگیا۔ اگر وہ اتنا دلکش اور بے باک نہ ہوتا تو شاید اسوقت ڈائننگ ہال میں کوئی غیر خوشگوار واقعہ ہو جاتا۔ مگر میں اس کو صرف خاموشی سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ میرے ذہنی تذبذب کا اندازہ لگاتے ہوئے بولا۔ "اس لئے میں صبح آپ سے معافی مانگنے آیا تھا۔"

میں اب بھی کچھ نہ بولا۔ مجھے شا کے ڈرامے اور موپاساں کی وہ کہانیاں یاد آنے لگیں جن میں کم عمر لڑکے بیاہتا عورتوں سے عشق کرتے اور ان پر سانیٹ لکھتے ہیں۔ یہ سب پڑھتے ہوئے مجھ کو کبھی بڑا مزہ آتا تھا اور خود میں اپنی ایک ٹیچر کے بارے میں ادٹ پٹانگ جذبات کا شکار رہ چکا تھا۔ مگر کبھی وہ سب تو انگلستان اور فرانس کی باتیں ہیں۔ ان صاحبزادے کو کیا سوجھی کہ نہ صرف یہ کہ میری نئی نویلی بیوی کا پیچھا کریں بلکہ اپنے عشق کا اظہار میرے سامنے کریں۔

"شوہر بیوی" یہ الفاظ ذہن میں آتے ہی مجھ کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ میں چار پانچ مہینے پہلے تک میں خود ہی ایک طالب علم تھا اور نسیمہ تو اب بھی کسی اسکول کی طالبہ لگتی تھی۔ اس کو بیوی کہنا تو بڑا ظلم تھا ——— یہ سب باتیں میرے ذہن میں چند ہی منٹوں کے اندر گھوم گئیں اور وہ لڑکا میز پر رکھے ہوئے کافی سٹ سے کھیلتا رہا۔

"آپ کیا کرتے ہیں، کہیں پڑھتے ہیں؟"

"میں نے سینیئر کیمبرج کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا۔ نیوی میں آگیا ہوں۔ اور جلد ہی ٹریننگ پر چلا جاؤں گا۔" اب وہ بڑے اطمینان سے باتیں کرنے لگا۔ جیسے ہم دونوں دوست ہوں اور ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کے مشتاق ہوں۔

"یہاں کشمیر کیسے آنا ہوا؟"

اس نے بات ٹالتے ہوئے سرسری طور پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ "ایسے ہی گھومنے ——"

"یا عشق لڑانے اور دل بہلانے ——" نہ جانے کیوں یہ گھٹیا الفاظ میرے ہونٹوں سے پھسل پڑے۔ اصل میں ہر انسان کے ذہن میں کمینہ اور سفلہ جذبات کہیں کسی گوشے میں مستور رہتے ہیں اور بڑے بے تکے موقعوں پر ان کا اظہار ہو جاتا ہے۔ اس دلکش اور کم عمر لڑکے نے کچھ ایسی نظروں سے مجھے دیکھا کہ باوجود سردی کے میں شرم سے پسینہ پسینہ ہو گیا اور اپنے گھٹیا پن پر تاسف کرنے لگا۔ وہ یہ کہتے ہوئے اُٹھ گیا۔ "آپ نے غلط سمجھا۔"

تھوڑی دیر تک تو میں نے اپنے کو ملامت کی۔ مگر پھر اپنی غلطی کا جواز بڑی عقلیت پرستی کی بنیاد پر خود ہی پیش کرنے لگا —— "ٹھیک ہے۔ مگر وہ تو بدمعاشی کر رہا ہے۔ بتایئے۔ بھلا آپ کو کشمیر آکر صرف اس خاکسار ہی کی بیوی پر عاشق ہونے کی کیا ضرورت تھی، اور ہو بھی جایئے تو کوئی آپ کو منع نہیں کر سکتا۔ آپ کیا ساری دنیا میری بیوی کے عشاق میں شامل ہو جائے تب بھی میں کیا بگاڑ سکتا ہوں مگر صاحبزادے کو آکر مجھ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ صریحاً حرامزدگی ہے۔" مگر اتنی بھونڈی گالی اس لڑکے کے بارے میں سوچتے ہی میں ایک بار پھر نادم ہو گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی دروازہ بند کر دیا اور صوفے پر پڑا ہوا نہ معلوم کیا کیا فضول باتیں سوچتا رہا۔ احدو آتشدان میں آگ جلا گیا تھا۔ اس لئے کمرے میں بڑی خوشگوار گرمی تھی۔ ورنہ باہر گہرے بادلوں نے پورے ہوٹل کو اپنی دبیز چادر میں لپیٹ لیا تھا اور شاید ہلکی بارش

بھی ہو رہی تھی۔ آتشدان میں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالتے ہوئے میرا خیال بنارس کی گرمی کی طرف گیا۔ فدا عباس، گورچرن، بروا اور جلیبہا گرمی سے پریشان ہو کر شام ہی سے رکشوں پر لد کر سارناتھ جاتے ہوں گے اور وہاں کھلی ہوا میں ہندوستان کی آزادی اور گاندھی جی کی تحریک کے بارے میں بحثیں کرتے ہوں گے۔ انھیں کیا معلوم کہ یہاں سردی سے دانت بج رہے ہیں۔ میں سوچتے سوچتے ہنس پڑا۔ تسنیمہ شاید مجھ کو دیکھ رہی تھی، اس لئے حیرانی سے بولی۔ "کیوں ہنسے؟"

"تم جگ رہی ہو —؟"

"میں بڑی دیر سے آپ کو دیکھ رہی ہوں — نہ معلوم کیا سوچ رہے ہیں؟"

"مجھے ان صاحبزادے پر ہنسی آرہی ہے۔ وہ ابھی ڈائننگ ہال میں ملے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مجھے آپ کی بیوی سے لَو ہو گیا ہے۔" میں نے یوں ہی تسنیمہ کو چڑانے کے لئے بات بڑھا کر کہی۔

تسنیمہ پہلے تو ہنسی، پھر غصّے میں بولی۔ "آپ نے ان کی کچھ تواضع کی؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ کوئی آدمی اگر آپ سے عشق کر رہا ہے تو دنیا کے کس قانون کی رُو سے میں اس کو روک سکتا ہوں، پہلی بات، دوسری بات یہ کہ میں اس لڑکے میں کچھ اپنی پرچھائیں دیکھتا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ جری ہے اور میں ہمیشہ بزدل رہا ہوں تیسری بات یہ کہ میں آپ کے ماضی سے واقف کبھی نہیں ہوں اس لئے کچھ کہتے ڈرتا ہوں اور چوتھی اور آخری بات یہ کہ میں آپ کو چاہتا ہوں اس لئے فطری طور پر آپ کے سب چاہنے والوں کو پسند کرتا ہوں۔"

تیسری بات میں نے تسنیمہ پر چوٹ کرنے کے لئے کہی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس کے کسی ہم جماعت نے اس سے شادی کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس چوٹ کی شدت کو کم کرنے کیلئے چوتھی بات میں نے محض اس کو خوش کرنے کے لئے کہی اور اس کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

"ہونھ آپ کی باتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ کوئی غیر آدمی آپ کی بیوی کی آپ کے منھ پر

تعریف کرے اور آپ کو بُرا بھی نہیں لگے گا۔"

"کیا ضرورت۔ ہاں اگر آپ کے بارے میں وہ بہتان تراشیوں سے کام لے تو کچھ کہا جا سکتا ہے۔"

"بہر حال اب کی اگر وہ صاحبزادے دکھائی دیئے تو آپ نہیں میں خود ان کے مزاج پوچھوں گی۔" نسیمہ نے تنگ آکر کہا۔

"نہیں نہیں بھئی، کوئی ایسی ویسی بات نہ کر بیٹھنا کہ خواہ مخواہ کا اسکنڈل کھڑا ہو جائے۔" مجھے خیال آیا کہ اکثر متوسط درجے کی خواتین اپنی پاک دامنی کے اظہار کے لیے ایسے غیر شریفانہ افعال پر اتر آتی ہیں کہ اور بھی رسوائی اور جگ ہنسائی ہوتی ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ وہ تمام دن بلا کی تفریح یا خوشی و مسرت کے گزرے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ایک کانٹا تھا جو ہم دونوں کے رہ رہ کے چبھ رہا تھا۔ نسیمہ کی پریشانی اور الجھن کا سبب یہ تھا کہ اس نے بڑے شوق سے کشمیر کی تفریح کا پروگرام بنایا تھا اور مجھ کو اپنے آپ سے ہمدردی تھی کہ اس پروگرام پر تمام اخراجات فضول ثابت ہوئے۔ مجھ کو نسیمہ سے بھی ہمدردی تھی مگر اس کے ساتھ ہی اس خوبصورت اور دل کش لڑکے سے بھی ہمدردی تھی جو بیچارہ معلوم نہیں کس خبط کا شکار ہوگیا تھا۔ میں نے اپنے سری نگر کے دوران قیام میں تقریباً ہر جگہ دیکھا۔ جہاں جہاں ہم دونوں تفریح کے لئے جاتے وہ لڑکا آس پاس کہیں ضرور دکھائی دے جاتا۔ تھک کر ہم لوگوں نے وقت سے پہلے ہی واپسی کا فیصلہ کر لیا۔

روانگی کے دن میں دو تین کاموں سے فرصت پا کر کافی ہاؤس گیا۔ دہاں دو چار ملنے والوں سے ملاقات کی۔ وہیں مجھ کو وجے شنکر بھی مل گیا۔ میں نے اس کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی اور وہ تیار ہو گیا۔ ہم دونوں ایک نسبتاً خاموش ہوٹل میں گئے، جہاں ٹھنڈی بیئر کا لمبا سا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے پوچھا۔ "آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

اُس نے مجھ کو ایک عجیب انداز سے دیکھا اور چپ رہا۔ میں نے پھر کہا۔ "آج ہم لوگ جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ آپ کو اپنی بیوی سے متعارف کرا دوں۔ آپ خود بھی تو کبھی

اُن سے بات کر لیجیے"۔

وہ کچھ نہیں بولا بلکہ ٹھنڈی بیئر پیتا ہوا کچھ سوچتا رہا۔ آخر میں جب میں نے اس کو اپنے ساتھ ہوٹل لے جانا چاہا تو وہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔

اس روز ہم لوگ ایک دوست کی موٹر کے ذریعے واپس میدانوں کی طرف چل دیئے۔ ہماری اسٹیشن ویگن کا ڈرائیور راستے بھر طرح طرح کے قصے سناتا رہا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ نہ تو نسیمہ نے کچھ سنا اور نہ میں نے۔ رات کو ہم لوگ ایک "نسبتاً غیر آباد اور گمنام گاؤں کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرے۔

میں تھکا ہوا تھا۔ گرم بستر بچھنے کا انتظار کیے بغیر صوفے پر ہی کمبل تان کے سو گیا۔ نسیمہ دیر تک کچھ لکھتی رہی۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا بیڈ روم میں پرانی وضع کا فانوس روشن تھا جس کی روشنی میں نسیمہ کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے پردے کی اوٹ میں ہو کر دیکھا۔ وجے شنکر سامنے کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے ذہن کے سارے تار ایک دم جھنجھنا اٹھے۔ اپنی تمام ترقی پسندی کے باوجود میں اسوقت شنکر کو نسیمہ کے بیڈ روم میں دیکھ کر غصہ سے کھول اٹھا مگر پھر بھی چند لمحوں تک خاموشی سے سارا منظر دیکھتے رہنے میں ہی مصلحت سمجھی۔ وہ بہت آہستگی سے انگریزی میں اپنے دماغ کی کیفیت بتا رہا تھا اور برابر معذرت بھی کیے جا رہا تھا اور نسیمہ خاموش بیٹھی سب کچھ سُنے جا رہی تھی۔

"تو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" نسیمہ نے درشت لہجے میں پوچھا۔ "تم کو معلوم ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ دوسری شادی نہیں کر سکتی ہوں۔ میرا شوہر خود پسند کیا ہوا ہے۔ کوئی جبر و تشدد کی بات بھی نہیں ہے کہ میں اُسے چھوڑ دوں۔ اس کے علاوہ اس کو مجھ پر زبردست اعتماد ہے"۔

مجھ میں ذرا سکون کے آثار پیدا ہوئے اور میں نے سارے ڈرامائی منظر میں دلچسپی لینا شروع کی۔

"آپ میری ایک خواہش پوری کر دیں"۔

"نسیمہ نے کچھ سوچا اور بولی۔ "کہو جو کہو منظور ہے مگر تم کو بھی میری شرط پوری کرنا ہوگی"۔

"شوق سے جو کہیئے"۔

لڑکے نے جیب سے ایک انگوٹھی نکالی اور بولا "یہ میں آپ کے ہاتھ میں پہنا کر آپ کے ہاتھ کو ......" وہ شرم سے سُرخ ہوگیا اور کچھ نہ کہہ سکا۔

نسیمہ نے خاموشی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ لڑکے نے تھرتھراتے ہاتھوں سے اس کو انگوٹھی پہنائی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر نسیمہ کے خوبصورت سنگ مرمر ایسے ہاتھ پر گر رہے تھے۔ پھر اس نے بے اختیار ہو کر نسیمہ کے ہاتھ کو اپنی آنکھوں سے لگا لیا اور فوراً ہی چھوڑ دیا۔

"بس" نسیمہ نے ایک زبردست احساس طمانیت کے ساتھ کہا۔

"بس جی۔ میری خواہش پوری ہوگئی۔ اب آپ کہیے؟"

"میں ــــ؟ مجھے یہ کہنا ہے کہ ڈاک بنگلے کے سامنے والی چہار دیواری پر کھڑے ہو کر نیچے گھاٹی میں چھلانگ لگا دو۔" مجھے معلوم ہوا جیسے نسیمہ مذاق کر رہی ہو۔ مگر اس کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا اور وہ جو کچھ بھی کہہ رہی تھی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

لڑکے نے بہت ہی مسکرا کر دونوں ہاتھوں سے نسیمہ کو پرنام کیا اور باہر نکل گیا۔ نسیمہ نے اپنے کمرے سے اور میں نے اپنے کمرے کے شیشوں سے دیکھا۔ وہ لڑکا نیچی سی چہار دیواری پر کھڑا ہوا، اتھاہ اندھیرے گھرے بادلوں اور ہلکی بوندا باندی میں ایک آسیب کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اُس نے پلٹ کر ڈاک بنگلے کی طرف دیکھا اور شیشے میں نسیمہ کا چہرہ دیکھ کر پھر شاید مسکرایا یا افسردہ ہوگیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ سیکڑوں فٹ گہری گھاٹی میں کود پڑا۔

گھاٹی میں کسی کے گرنے کی آواز یا چیخ بھی تیز ہواؤں کی وجہ سے سنائی نہیں دی۔ مگر نسیمہ خاموش بُت بنی ہوئی دروازے کے شیشوں سے باہر تاریکی میں دیکھتی رہ گئی۔ وہ مجھے اس وقت اتنی ذلیل اور اتنی کمینی معلوم ہو رہی تھی کہ میں سر پکڑ کر اپنے صوفے پر بیٹھ گیا اور دوبارہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

صبح ہمیشہ کی طرح ہوئی۔ کسی کو اس سارے ڈرامے کا علم بھی نہیں ہوا۔ نسیمہ کے خیال میں مجھ کو بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔ صبح اس نے میرے ساتھ چائے نہیں پی بلکہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ

کر کے جلد سے جلد روانگی پر زور دیتی رہی۔

ان باتوں کو بہت دن ہو چکے ہیں۔ مجھ میں اور نسیمہ میں اس بارے میں کبھی ذکر بھی نہیں ہوا جیسے ہم دونوں میں کوئی غیر تحریری قسم کا معاہدہ ہو چکا ہو کہ کشمیر کی رخصت کا ذکر ہماری باتوں میں کبھی نہیں آئے گا اور ڈاک بنگلے کا واقعہ تو نسیمہ کو پورا یقین تھا کہ مجھے معلوم ہی نہیں ہو سکا۔

آج ان سب باتوں کو ایک زمانہ گزر چکا ہے۔

درمیانی مدت میں ہزاروں دلچسپ اور غیر معمولی واقعات پیش آئے۔ بیسیوں ایسے مواقع بھی آئے، جب ہم میں اور نسیمہ میں معمولی اختلاف پر خاصی کشیدگی ہو گئی۔ بہت بار ایسا ہوا کہ نسیمہ نے میرے بے رخی کی شکایت کی۔ متعدد بار اس نے قسمت کا شکوہ بھی کیا کہ اس کی کیسی بیقدری ہو رہی ہے۔ پر تمام شکایتوں، طعنوں، اشتعال انگیزیوں یا محبت اور خلوص کے مظاہروں کے باوجود ہم میں کبھی ان دنوں کا ذکر نہیں آیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ عام خود غرض عورت کی طرح وہ وجے شنکر کو فراموش کر چکی ہے۔ مگر میں نے ایک دو بار نہیں بلکہ کئی بار بڑے جذباتی موقعوں پر اس کو یاد کیا۔ اس کی خوبصورت جیتی جاگتی شبیہہ جب میری آنکھوں کے سامنے آتی تو میں اپنے تصور ہی تصور میں آنسوؤں کی بجے مالا چڑھاتا۔

لیکن اب مجھے یہ واقعات بہت شدت سے یاد آ رہے ہیں کیونکہ میرے پاس خالد کے کئی خط آئے ہیں جن میں اس نے مختلف طریقوں سے دنیا میں محبت کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس نے ایک خط میں لکھا ہے کہ محبت ایک اہم سماجی ضرورت ہے۔ میں اس کے خطوں کو نظر انداز نہیں کرتا ہوں بلکہ دوست کی طرح اس کے نظریات سے اتفاق یا اختلافات کرتے ہوئے اس کے خطوں کا جواب دیتا ہوں۔

ایک دن شام کو جب میں دفتر سے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ خالد یہاں آ گیا ہے اور ابھی نہا کر سویا ہے۔

میں نے نسیمہ سے مگر اس نے تشویش کے ساتھ صرف اتنا کہا: "معلوم نہیں کیسے آ گیا ہے۔

کہہ رہا تھا کہ کالج سے دو دن کی چھٹی لے کر آگیا ہوں۔ بہت پریشان لگتا تھا۔"

نسیمہ کا خیال تھا کہ کالج میں کسی سے جھگڑا ہوگیا یا پیسے کی کوئی اہم ضرورت پیش آئی ہے جس کی وجہ سے خود آپہنچا ہے۔ میں نے شرارت آمیز لہجے میں مُسکرا کر کہا۔ "صاحبزادے کو عشق ہوگیا ہے کسی سے۔"

وہ ایک دم بُرا مان کر بولی۔ "آپ کو تو بس ایسی سوجھتی رہتی ہے...."

میں خالد کے کمرے میں گیا۔ وہ آنکھیں کھولے ہوئے برابر چھت کو دیکھے جارہا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھا۔ "آگئے آپ!" وہ کچھ شرمندہ سا تھا۔ مگر میں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کردیں اور وہ باقاعدگی سے میرے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ باتوں باتوں میں وہ خود اصل موضوع کی طرف آگیا اور بہت ہی باغیانہ اور سرپھرے انداز میں بولا کہ "وہ بغیر سحاب کے نہیں رہ سکتا۔"

میں نے سنجیدگی سے دوستانہ طور پر کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر تم سحاب میں دل چسپی رکھتے ہو اور وہ خود بھی تم سے متاثر ہے تو پھر تم میرے پاس کیوں آئے ہو۔ تم دونوں جو فیصلہ کروگے اس میں ہم لوگوں کو بھی خوشی ہوگی۔" مجھے اندازہ تھا کہ نسیمہ کمرے کے دروازے سے لگی ہوئی ہماری باتیں سن رہی تھی۔

"بات اتنی آسان نہیں ہے۔" خالد نے اصل مشکل کی طرف مجھ کو متوجہ کرایا۔ "اصل میں سحاب اپنے گھر والوں کے خلاف کچھ نہیں کرسکتی اور گھر والوں سے بات چیت دوسری ہی سطح پر ہوسکتی ہے۔"

"میں تمھارا مطلب سمجھ گیا۔ مگر اس سلسلے میں میرا دلچسپی لینا قطعی مناسب نہیں ہوگا۔ پہلی بات تو یہ کہ ہماری تمھاری بے تکلفی دوستوں کے انداز کی ہے۔ دنیا والے باپ بیٹوں میں اس طرح کی مفاہمت اور بے تکلفی کو گوارا نہیں کرسکتے۔"

"مگر ڈیڈی آپ ہی دنیا والوں کو گولی مارنے کی تلقین کرتے ہیں۔"

"ہاں جہاں تک میری سوچی سمجھی رائے کا تعلق ہے میرا رویہ ایسا ہی ہے۔ مگر سحاب کے

بارے میں صورت حال ذرا مختلف ہے اور وہ یوں کہ میری ان لوگوں سے کوئی جان پہچان نہیں ہے۔ جو کچھ حال تم نے بتایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ خاصے پیسے والے ہیں اور اس وجہ سے خاصے بد دماغ بھی ہیں۔ بہر حال اگر میں کسی ذریعے سے بات چیت کا کوئی سلسلہ نکالوں تو اس کی نوعیت بڑی باضابطہ ہوگی اور ایسی صورت میں دو سوال اُٹھیں گے جن کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ پہلا تو یہ کہ لڑکے کی یعنی تمہاری عمر صرف بیس سال ہے۔ اس قدر کم عمری میں شادی کی عجلت کیوں۔ دوسری بات یہ کہ تم پڑھ رہے ہو، بی۔اے کے پہلے سال میں ہو۔ اگر کچھ کہا بھی جائے تب بھی لوگ یہی کہیں گے کہ تعلیم پوری کئے بغیر شادی کا کیا سبب۔ پھر تمہارے مستقبل کا سوال اٹھے گا۔ یہ وہ زمانہ تو ہے نہیں کہ میں یہ کہہ کر لوگوں کو خاموش کر سکوں کہ گھر میں دیا اللہ کا سب کچھ ہے۔ اصل میں گھر میں کچھ بھی نہیں ہے اور اگر کچھ ہے بھی تو وہ تمہاری تعلیم ہی کے لئے بمشکل کافی ہو سکے گا۔ بنیادی سوال یہ اٹھے گا کہ تم خود کیا کر رہے ہو۔ یا کرنا چاہتے ہو؟ اگر فارن سروس میں جانے کا خیال ہے جس کے لئے تم شروع ہی سے کہہ رہے ہو تو اس کے لئے بڑی محنت اور سکون چاہیئے۔ اگر فرض کیا کہ تمہاری شادی ہو بھی گئی تو ایسی صورت میں تمہارا فارن سروس میں جانے کا خیال تشنۂ تکمیل رہے گا۔ کیونکہ شادی اور اس کے بعد ایک آدھ سال جن دلچسپیوں میں گزرے گا ان میں مقابلے کے لئے امتحان کی تیاری ناممکن ہے۔ یہ باتیں تم ایک دوست اور ایک باپ کی طرف سے سن رہے ہو۔ میری یہ دونوں حیثیتیں تمہاری خوش حالی کے لئے ہیں!"

خالد چپ رہا۔ ظاہر تھا کہ وہ میری باتوں سے پوری طرح متفق تھا۔

"مگر پھر بھی جذبات کی منزل پر میں تمہارا رفیق ہوں۔ ان معنوں میں کہ تم سحاب کو اس کے گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کرنے پر رضامند کر لو۔ اگر وہ تمہارے ساتھ بھاگ کر یہاں آجائے تو میں بصد شوق تم دونوں کا استقبال کروں گا اور ایسی صورت میں وہ تمام مشکلیں جو دلیلوں کی شکل میں میں نے تمہارے سامنے پیش کی ہیں خود بخود دور ہو جائیں گی"

خالد "بھگانے" کے لفظ پر چونکا اور حیرت سے بولا "ڈیڈی! آپ.....؟"

انور

زمین کے نیچے

میری بھی ایک ہوبی ہے۔ میری ہوبی چہروں کو غور سے دیکھنا ہے۔ میں ہر چہرے کو غور سے دیکھتا ہوں۔ بچوں کے چہرے۔ بوڑھوں کے چہرے۔ لڑکوں کے چہرے۔ لڑکیوں کے چہرے۔ مردوں کے چہرے، عورتوں کے چہرے۔ اس طرح میری نظر کلیوں کی کیاریوں میں، بنجر زمینوں میں اور سرسبز میدانوں میں سے ہوتی ہوئی درہ خیبر کی خوفناک گھاٹیوں میں جا پہنچتی ہے جہاں اگر کسی کی نظر کسی عورت پر پڑ جائے تو اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

میری ہوبی بڑی خطرناک ہے۔ اس کے آزاد سرے غنڈہ ایکٹ سے ٹکراتے ہوئے، رگڑ کھاتے ہوئے گزرتے ہیں۔ اس کے ڈانڈے تعزیراتِ پاکستان کی مشہور دفعات کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے جیل کی سلاخوں سے جا ملتے ہیں۔

یا خدا! میں نے یہ ہوبی کیوں اختیار کی؟

اس سے تو بہتر تھا کہ میں تتلیوں کے پر جمع کرتا اور ان کو اپنے ڈرائنگ روم کی دیواروں پر سجا کر اس کو نمائش گاہ بنا لیتا اور میں نے پینٹنگ کی ہوبی کیوں نہ اختیار کی؟ پینٹنگ کی ہوبی جس کو پکاسو نے اس قدر آسان کر دیا ہے کہ چھ ماہ کا ایک بچہ رنگوں اور برشوں اور ہاتھوں کی مدد کے بغیر اپنے پیروں سے اور اپنے پیشاب سے تجریدی آرٹ کے بہترین نمونے پیدا کر سکتا ہے اور پھر کتابیں پڑھنے کی ہوبی بھی تو تھی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی کتاب ہاتھ میں ہو تو کافی ہاؤس میں یا کسی ادبی میٹنگ میں بیٹھا ہوا انسان کبھی ایڈیٹ معلوم نہیں ہوتا گھر کی سب دیواروں کے ساتھ کتابوں کی الماریاں کھڑی ہوں اور سب الماریوں میں موٹی موٹی کتابوں کی ڈبل قطاریں لگی ہوں، تو انسان خواہ مخواہ ایک بڑا ادیب یا ایک بڑا شاعر یا ایک بڑا نقاد معلوم ہوتا ہے، چاہے

وہ کیبنیٹ منسٹر ہو۔ اور کتابیں پڑھنے کی ہوبی یعنی کتابیں جمع کرنے کی ہوبی انسان کی موت کے بعد اس کے وارثوں کے لئے اور لاوارثوں کے لئے بڑی بھاری جائداد ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اب کتابیں کرم خوردہ ہوکر نوادرات میں شامل ہوگئی ہیں۔ خصوصاً وہ کتابیں جو فٹ پاتھ پر سے پہلے ہی کرم خوردہ خریدی گئی تھیں، اب اور بھی کرم خوردہ ہوکر بالکل نایاب ہوگئی ہیں، چنانچہ آپ کے سویم پر آپ کا خلف رشید آپ کی کتابوں کا قیمتی سرمایہ اردو بورڈ کے کسی عہدہ دار کو اس کی فاتحہ ختم کرتے ہی پانچ سو فیصدی منافع پر فروخت کر دے گا۔ اور اگر آپ کو یہ غلط فہمی ہے کہ آپ کی موت تک اردو بورڈ کا وجود ختم ہوچکا ہوگا تو اس غلط فہمی کو فوراً سے بیشتر دور کیجئے۔ اور بورڈ کا وجود کبھی ختم نہیں ہوگا۔ کیونکہ اردو بورڈ کا کام صرف اردو لغت تیار کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اسکا کام حکومت سے مالی امداد لینا بھی ہے۔

اور میری ہوبی کیا ہے؟ میں ایک چہرے کو غور سے دیکھتا ہوں اور اس کو تحت الشعور یا شعور کے تاریک غاروں میں پھینک دیتا ہوں۔ اور پھر سالہا سال تک اس بات کا انتظار کرتا ہوں کہ وہ چہرہ مجھے پھر نظر آئے تاکہ میں ان تاریک غاروں سے اس کی شبیہ کو نکال کر یہ دیکھوں کہ یہ وہی چہرہ ہے یا کوئی اور ہے۔ یا یہ چہرہ وہی ہوتے ہوئے بھی تو کوئی اور تو نہیں ہے۔ میں کسی لڑکی کا چہرہ دیکھتا ہوں تو یہ سوچتا ہوں کہ یہ کونسی لڑکی کھڑی ہے۔ جب میں کسی عورت کا چہرہ دیکھتا ہوں تو اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ ماں لڑکی سے زیادہ خوبصورت ہے۔ پھر میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ لڑکی خوبصورت ہوتی ہے یا ماں خوبصورت ہوتی ہے۔ جب میں کسی بوڑھے کا چہرہ دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ اب آخری بس سٹوپ نزدیک ہے۔ اور جب آخری بس سٹوپ آجاتا ہے تو میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ آخری بس اسٹوپ ہے یا پہلا بس اسٹوپ؟

اس طرح میں چہروں کی تلاش میں جگہ جگہ گھومتا پھرتا ہوں۔

اور میں اس وقت پرانی کلفٹن پر بیٹھا ہوا ہوں۔

پرانی کلفٹن کی چٹان تھیٹر سے سٹیج کی طرح جمی ہوئی ہے۔ زندگی کا ڈراما ہو رہا ہے۔ سامنے گھرائی میں ببول کے درخت، ان سے پرے کلفٹن کی عمارت، اس کے پاس گھاس کے قطعے اور پھولوں کے تختے۔ انکے آگے ساحل کی ریت، سمندر کی لہریں، پانی میں ابھری ہوئی چٹانیں، منوڑے کا جزیرہ، اور اس کا لائٹ ہاؤس پرانی کلفٹن کی سٹیج پر زندگی کا ڈرامہ دیکھ رہے ہیں۔ اور میں اس پتھر کے بنچ پر بیٹھا ہوا ایسا محسوس کر رہا

ہوں جیسے میں اس ڈرامے کا ڈائرکٹر ہوں۔

میرے پاکستان رائٹرز گلڈ کا ایک ممبر بیٹھا ہے جو ہر ممکن طریقے سے میرا وقت ضائع کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اس کی کوئی بات نہیں سنی لیکن اس کی آخری بات سننے کے لائق تھی۔

اس نے کہا۔ میاں ہم تمھیں بتائے دیتے ہیں۔ تم بڑے ادیب ہرگز نہیں ہو اور نہ تم بڑے ادیب بن سکتے ہو۔"

اس بات سے اس نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور میں نے کہا۔" یقیناً میں بڑا ادیب نہیں ہوں اور نہ میں بڑا ادیب بن سکتا ہوں۔ آپ کے فیصلے کے پہلے مجھے اس صداقت کے ثبوت مل چکے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میرے ماں باپ زندہ ہیں۔ بڑا ادیب بننے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو جائیں۔ چنانچہ غالب کے ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے اور چارلس ڈکنز کو بڑا ادیب بننے کے لیے یتیمی کی ٹھوکریں کھانی پڑی تھیں۔ دوسرے بڑے ادیبوں کے بارے میں میں نے تحقیقات نہیں کی ورنہ میں ثابت کر دیتا کہ تمام بڑے ادیب بے چارے یتیم تھے اور سب نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز پر لوگوں سے داد کی بھیک لینے کے لیے "یتیموں کی فریاد سن لیجئے" کا گیت گایا تھا۔ بلکہ اس سلسلے میں تحقیقات کی بھی ضرورت نہیں۔ فارمولا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یعنی چونکہ وہ بہت بڑے ادیب تھے اس لیے ان کے ماں باپ بچپن میں ضرور مر گئے ہوں گے۔ بائی دی وے، آپ کے ماں باپ زندہ ہیں یا فوت ہو گئے ہیں؟"

اس نے جھنجھلا کر جواب دیا۔" زندہ ہیں۔"

میں جلدی سے بولا۔" مجھے افسوس ہے۔"

اور وہ بھی جھنجھلا گیا اور کہنے لگا۔" دیکھو، اس بکواس کو تو بند کرو اور مجھ سے پوچھو کہ میں یہ کیوں کہتا ہوں؟"

میں نے کہا۔" میں جانتا ہوں اس کا دوسرا ثبوت۔"

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔" تم کچھ نہیں جانتے۔ چپکے بیٹھے رہو اور میری باتیں غور سے سنو!"

میں نے اپنے آپ پر احترام طاری کرتے ہوئے کہا۔" بہت اچھا ابا جان!"

وہ بولا۔" دیکھو! ہماری رائے تمہارے بارے میں یہ ہے کہ تم میں ایک بڑا ادیب ہونے کے آثار پائے

جاتے ہیں۔ لیکن تمھیں احتیاط کی ضرورت ہے۔ تمھارے ادب میں ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا؟"

اس نے جواب دیا "زبان۔"

"زبان تو میرے منہ میں ہے۔"

"دیکھو! تم بے وقوف نہ بنو۔ نہ دوسروں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرو۔ تم خوب جانتے ہو کہ زبان سے میری مراد کیا ہے۔ تمھارے افسانوں کی زبان درست نہیں ہوتی۔ تم مستند اردو نہیں لکھتے۔ تم انگریزی بولتے ہو۔ انگریزی میں سوچتے ہو اور اردو میں لکھتے ہو۔ اردو ادب تمھیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اردو ادب میں تمھیں کوئی مقام نہیں مل سکتا۔"

یہاں ہماری گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ایک لمبی داڑھی والے شخص نے ہمارے پاس آکر زور سے السلام علیکم کہا۔ ہم چونک گئے۔

لمبی داڑھی والے نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ نے پہچانا نہیں مجھے؟"

میں نے اپنی نظروں سے اس کی داڑھی کے بال پرے ہٹا کر اس کو پہچان لیا۔ وہ این۔ ڈی۔ انصاری تھا۔ یعنی نور دین انصاری۔ چونکہ وہ نرا نور دین تھا۔ اس لیے اس نے اپنے نام انگریزی کا ملمع چڑھا کر اسکو این۔ ڈی انصاری کر لیا تھا۔ جس طرح بدوضع لوگ انگریزی لباس پہن کر خوشگوار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بدصورت نام انگریزی لباس پہن کر خوشگوار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بدصورت نام انگریزی لباس پہن کر خوبصورت ہو جاتے ہیں مثلاً اے۔ ڈی سبزواری۔ یعنی اللہ دتا سبزواری جس کا سلیس اردو میں ترجمہ اللہ دیا سبزواری ہوتا ہے۔ اور جیسے ایف۔ ایم بلتستانی یعنی فقیر محمد بلتستانی۔

نور دین میرا کلرک تھا۔ وہ اپنے کندھوں پر اتنا بوجھ اٹھا سکتا تھا جتنا گدھا اٹھا سکتا ہے۔ اسلئے اس نے میرے دفتر کے کام کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایف۔ اے۔ پاس کیا۔ پھر بی۔ اے اور پھر ایل۔ ایل۔ بی۔ اس کے بعد اس نے ملازمت چھوڑ دی۔

وکیلوں کے سائن بورڈ پر ایسے نام مؤثر ثابت نہیں ہوتے جیسے نور دین بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔

یا جمعہ خاں ۔ بی ۔ ایس ۔ سی ۔ ایل ۔ ایل ۔ ڈی ۔ یا اللہ ڈوایا ایم ۔ اے ایل ۔ ایل ۔ بی ۔ کیونکہ ایسے نام ایل ۔ ایل بی کو بھی نور دین بنا کے رکھ دیتے ہیں ۔

ایک دن میں جونا مارکیٹ میں سے گزر رہا تھا ۔ پرانے کوٹھوں کی ایک دکان کے اوپر دوسری منزل کی اکھڑے ہوئے پلستر اور دھندلائے ہوئے چونے والے ایک کھڑکی پر مجھے ایک سائن بورڈ نظر آیا ۔ این ۔ ڈی انصاری بی ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی ۔ میں اس بورڈ کو دیکھ کر اس طرح آگے بڑھ گیا جس طرح لوگ وکیلوں کے بورڈ دیکھ کر بڑھ جایا کرتے ہیں ۔

یکایک مجھے اس کھڑکی میں سے کسی نے آواز دی ۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ۔ وہ نور دین تھا ۔ اس کے منہ پر داڑھی نہیں تھی ۔ اس لئے میں نے فوراً اس کو پہچان لیا ۔ ہم فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے ۔

میں نے پوچھا " کیسی چل رہی ہے وکالت ؟ "

اس نے کہا " خوب "

میں نے پھر پوچھا " کتنی آمدنی ہو جاتی ہے ؟ "

اس نے جواب دیا " اس وقت میری ماہوار آمدنی پانچ روپے سے لے کر پانچ ہزار روپے تک ہے "

" پانچ روپے سے لے کر پانچ ہزار تک ، یعنی ؟ "

یعنی کسی مہینے تو پانچ روپے بھی نہیں ملتے ۔ کسی مہینے میں پانچ ہزار سے بھی زیادہ کما لیتا ہوں "

سامنے کی مسجد سے ایک بوڑھا سفید ریش دائیں ہاتھ میں تسبیح لٹکائے ہوئے ہمارے پاس سے گزرا ۔ اس نے میلے ملیشیا کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اس کے پاؤں میں نیا قیمتی جوتا تھا ۔ اس نے ہمارے برابر آ کر نور دین کو بڑے احترام سے سلام علیکم کہا اور پھر نیپئر روڈ کی طرف چلا گیا ۔

میں نے نور دین سے اپنی گفتگو جاری رکھی " کتنی مدت سے ملاقات نہیں ہوئی ۔ کیا کام کی زیادتی ہے ؟ "

اس نے جواب دیا " کام ہے بھی اور نہیں بھی ۔ کبھی تو مقدموں کے سلسلے میں پنجاب ، سندھ اور بلوچستان کے دوروں پر چڑھا رہتا ہوں اور کبھی ہفتوں ، مہینوں اس بیچ بارے میں پڑا کھٹمل مارتا رہتا ہوں "

میں نے کہا " معلوم ہوتا ہے تمھارے موکل دور دور پھیلے ہوئے ہیں "

وہ بولا " ہاں ، میں تمام مغربی پاکستان کے جیب کتروں کا وکیل ہوں "

میں نے ایک قہقہہ بلند کیا اور نور دین کے ایسی بے ساختگی سے یہ خبر بہم پہنچانے پر لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا" ویل ڈن، نور دین یہ نڈر فل، مجھے اتنی دیر کے بعد تم سے ملنے پر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ آج تم سے ملنے کے بعد میری ایک دیرینہ تمنا پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ شاید تمھیں معلوم ہے مجھے دو قسم کے انسانوں کی زندگی سے بے حد دلچسپی ہے۔ پاگلوں کی زندگی سے اور مجرموں کی زندگی سے، پاگلوں کی زندگی کا تو میں نے کافی مطالعہ کیا ہے۔ میں نے پاکستان کے سب پاگل خانے دیکھے ہیں۔ بد قسمتی سے پاکستان میں پاگل خانوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ حالانکہ اتنے بڑے ملک میں ہر شہر کے اندر بلکہ ہر محلے میں ایک پاگل خانہ ہونا چاہئے۔ ہماری نئی حکومت کو اس طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اور جہاں تک مجرموں کی زندگی کا تعلق ہے۔ میں اس کے مطالعہ سے بالکل محروم رہا ہوں۔ مجھے امید ہے تم مجھے اس کے موقعے بہم پہنچاؤ گے"۔

نور دین نے جواب دیا" انشاء اللہ"

اس دن کے بعد نور دین مجھے آج نظر آیا۔

میں نے پاکستان کے رائٹرز گلڈ کے ممبر سے نور دین کا تعارف کرایا" یہ ہیں مسٹر این۔ ڈی۔ انصاری بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل۔ اور یہ مسٹر دیوانہ دریا بُردی مشہور شاعر۔ تشریف رکھئے" انصاری صاحب!"

نور دین ہمارے پاس پتھر کے بنچ پر بیٹھ گیا۔

میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا" انصاری صاحب، آپ نے تو داڑھی رکھ لی ہے؟ آپ تو داڑھی کے خلاف تھے"۔

انصاری صاحب نے سنجیدہ ہو کر کہا" میرے موکلوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں بنیادی جمہوریت کے انتخاب میں حصہ لوں اور میرے ووٹروں نے مجھ پہ یہ شرط لگائی کہ جب تک میں مومنوں کی شکل اختیار نہ کروں مجھے ووٹ نہیں دیں گے"۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا" تم بنیادی جمہوریت کے ممبر بھی ہو؟"

اس نے فخر سے جواب دیا" مجھے بھاری اکثریت سے بنیادی جمہوریت کا نمائندہ چنا گیا ہوں"۔

دیوانہ دریا بُردی نے پوچھا" مقابلے میں کون تھا؟"

" میرے مقابلے میں سیاست دانوں کی حکومت کے دو وزیر تھے"۔

میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔" زندہ باد، بہت بہت مبارکباد، بہت بڑا معرکہ مارا!"

انصاری نے جواب دیا۔"شکریہ!"

اور پھر یہ کہہ کر کہ میں ابھی آتا ہوں، وہ ہمارے پاس سے اٹھ کر کینٹین کی طرف چلا گیا۔

انصاری کے جانے کے بعد دیوانہ دریابڑدی اور میں زبان کے مسئلے پر پھر تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔

میں نے کہا۔" دیوانہ صاحب! مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔ زبان موضوع سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ زبان ذریعہ ہے، مقصد نہیں ہے۔ راستہ ہے منزل نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کسی وقت زبان موضوع سے زیادہ اہم تھی۔ وہ ہمارے ادب میں غزل کا زمانہ تھا۔ غزل کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ صرف الفاظ ہوتے ہیں۔ غزل کے شاعر کو صرف یہ کہنا ہوتا ہے کہ وہ سات سال کی عمر میں ایک لڑکے یا لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا۔ اب ستر سال ہو گئے ہیں لیکن اس عشق میں کمی نہیں ہوئی۔ اس ایک بات کو ستر ہزار انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ الفاظ! الفاظ! الفاظ! کیونکہ سات سال کی عمر میں شروع ہو کر ستر سال کی عمر تک قائم رہنے والا عشق انسان نہیں کر سکتا، صرف الفاظ کر سکتے ہیں۔ پھر جب ہمارے پاس کہنے کے لئے اور بھی باتیں پیدا ہو گئیں تو نظم ایجاد ہوئی، افسانہ ایجاد ہوا۔ موضوع آگے بڑھ گیا۔ زبان پیچھے ہٹ گئی۔"

دیوانہ دریابڑدی نے کہا۔" کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اگر تمہارا تجزیہ درست ہے تو غزل دوبارہ کیوں زندہ ہو گئی ہے؟"

میں نے جواب دیا۔"غزل اس لئے دوبارہ زندہ ہو گئی ہے کہ شاعروں کے پاس اگرچہ کہنے کے لئے بہت کچھ ہے لیکن وہ کہہ نہیں سکتے۔ صلح کل ہیں، بزدل ہیں، کلرک ہیں۔"

دیوانہ دریابڑدی کے چہرے پر دیوانگی کے سے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے غصے میں اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔" اب تم پھر ذاتیات پر اتر آئے ہو۔ تم نے ہمیشہ مجھ پر ذاتی حملے کئے ہیں۔ تم میری اور میری غزل کی مقبولیت سے اس قدر جل گئے ہو کہ ہر جگہ میرے خلاف پروپیگنڈا کرتے پھرتے ہو۔ اس وقت تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں کلرک ہوں۔ اس لئے بزدل ہوں، اور غزل اس لئے کہتا ہوں کہ اس پر حکومت کی گرفت نہیں ہو سکتی اور نوکری کو گزند نہیں پہنچتا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں حکومت سے نہیں ڈرتا۔ اگر میں حکومت سے ڈرتا ہوتا تو آج میں کلرک نہ ہوتا۔ منسٹر ہوتا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ میں غزل کی محبت میں میٹرک بھی پاس نہیں کر سکا

اور تم ادب کے لئے میری اتنی بڑی قربانی کی قدر کرنے کی بجائے مجھ پر طنز کے تیر چلاتے ہو۔ میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ غزل اردو ادب کی بہترین صنف ہے۔"

میں نے دیوانہ وریا بُردی کی لمبی تقریر کا اندازہ لگا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "غزل اردو شاعری کا ایبسٹریکٹ آرٹ ہے جس میں دھوپ کی جڑوں اور گدھے کی سینگوں اور پہاڑ کی مینگنوں اور ہاتھی کے بچوں کو کوٹ کر اور کپڑ چھان کر کے مچھلی کے خون میں پکایا جاتا ہے۔ جب تین جوش آچکتے ہیں تو اس میں گھر یوں کا عرق ڈالا جاتا ہے۔ اس طرح جو قوام تیار ہوتا ہے اس سے ایک حسین وجمیل خاتون کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ اس تصویر کے نیچے صابن دانی لکھ کر اس کو نمائش میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ جب تماشائی پوچھتے ہیں کہ بھئی یہ صابن دانی کس طرف سے ہے تو ان پر لعنت بھیجی جاتی ہے۔ بالکل یہی حال غزل کا ہے۔ ایک شعر کہنے کے بعد غزل گو شاعر کے دماغ کا سوئچ آف ہو جاتا ہے اور اس پر مکمل نسیان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بھول جاتا ہے کہ وہ ابھی ابھی کیا کہہ رہا تھا۔ اس نے ابھی ابھی یہ کہا تھا کہ حضور چائے میں چینی ڈالنے کی کیا ضرورت ہے صرف چمچہ ہلا دیکھئے، چائے میٹھی ہو جائے گی۔ اور اب وہ یہ کہہ رہا ہے کہ حضور آپ رقیب کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر واپس جا رہی ہیں، میری قبر پر بھی ایک لمحے کے لئے فاتحہ کہنے کو ٹھہر جائیے۔ مُردوں کو زندہ کرنے کا کام یا تو حضرت عیسٰیؑ نے کیا تھا یا اب غزل کر رہی ہے۔"

اس کے بعد میری توجہ انصاری کی طرف چلی گئی۔ میں اپنی گفتگو کا سلسلہ قطع کر کے انصاری کو دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ انصاری ایک ایسے شخص کی طرف جا رہا ہے جس کو میں دیر سے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کہاں دیکھا ہے۔ میں اپنی باتوں کے دوران میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ لیکن میں اس کو پہچان نہیں سکا تھا۔ اور پھر جب میں دیر تک اسے پہچان نہ سکا تو مجھے خیال آیا کہ میں اس کو پہچاننے کی کوشش کیوں کر رہا ہوں۔ اور میں نے اس کو پہچاننے کی کوشش ترک کر دی۔

اب جب میں نے انصاری کو اس کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو میں نے اس کی طرف پھر غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا کہ اگر انصاری اس شخص کو جانتا ہے تو جب وہ میرے پاس واپس آئے گا تو میں اس سے اس کے بارے میں پوچھ لوں گا۔

لیکن انصاری نے اس کے ساتھ کوئی بات نہ کی وہ اس کے نزدیک سے گزر گیا اور ان چار آدمیوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا جو کینٹین کے سامنے کھڑے چائے پی رہے تھے۔ انصاری بھی ان کے ساتھ چائے پینے لگا۔

ادھر دیوانہ دریابردی غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے میری توجہ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "دیکھو! ہم تمھیں بتائے دیتے ہیں تمھارے خیالات زبان اور غزل کے بارے میں نہایت لغو اور لچر ہیں۔ ہم تو تمھارے دوست ہیں۔ لیکن اگر کسی کٹر اردو داں طبقے میں تم نے یہ باتیں کر دیں تو پٹ جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں، میں غزل کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ غزل بوڑھے بچوں کے لئے نرسری رائم کا کام دیتی ہے۔"

دیوانہ دریابردی نے پوچھا۔ "نرسری رائم کیا؟"

"نرسری رائم انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ نرسری رائم ایسے اشعار کو کہتے ہیں جن کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میں نثر میں اس کی مثال دیتا ہوں۔ مطلع ملاحظہ ہو۔ چاولوں کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ زمین گول ہے۔ مطلع ثانی ملاحظہ کیجئے۔ مچھلیاں درختوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سمندر میں آگ لگ گئی ہے۔ شعر سنئے ——"

"نہیں نہیں، میں نہیں سننا چاہتا، یہ سراسر بکواس ہے۔ یہ اردو ادب کی توہین ہے۔ خدا کے لئے اردو ادب کا پیچھا چھوڑو اور انگریزی میں لکھنا شروع کرو۔"

"میں انگریزی میں نہیں لکھ سکتا۔ انگریزی غیر ملکی زبان ہے۔ انگریزی سے میری صرف دوستی ہے۔ اردو سے مجھے محبت ہے۔"

دیوانہ دریابردی کے چہرے پر تھوڑی سی بشاشت پھیل گئی۔ وہ بولا۔ "مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے کہ تمھیں اردو سے محبت ہے۔ لیکن انگریزی سے دوستی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ انگریزی زبان ہمیں غلامی سکھانے کے لئے اس ملک میں آئی تھی۔ اب ہماری ذہنیت اس قدر غلامانہ ہو گئی ہے کہ انگریزی ہمیں اپنی دوست معلوم ہوتی ہے۔ اردو سے محبت کرنے والوں کو عربی اور فارسی سے دوستی کرنی چاہئے۔ عربی اور فارسی اردو کے والدین ہیں۔"

"میں نے کہا۔" اردو کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ عربی اور فارسی کم سے کم ہمارے ہاں تو ادب

کی حد تک انتقال کر گئیں۔ یہ ہمارے ماضی کے ادب کی زبانیں ہیں اور ہم حال میں اور مستقبل میں زندہ ہیں۔"

دیوانہ دریا بُردی میری گفتگو کا سلسلہ ختم کرنے کے لئے حقارت آمیز انداز میں اٹھ کھڑا ہوا اور نئی کلفٹن کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں کئی بسیں آکر کھڑی ہو گئی تھیں۔

اس نے کہا" میں پیدل واپس جانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ رش ختم ہو گیا ہے۔ چلو بس میں چلیں۔"

میں نے کہا" میں تو پیدل واپس جاؤں گا۔ آپ چلئے۔ میں بعد میں آجاؤں گا۔"

لیکن جانے سے پہلے اس نے ایک آخری بات کہنا اپنا فرض سمجھا" میں تمھیں ایک دفعہ پھر مشورہ دوں گا کہ اپنی زبان کی طرف توجہ دو با محاورہ زبان لکھو اور اس میں چٹخارہ پیدا کرو۔"

میں نے جواب دیا" مجھے محاوروں اور فارسی ترکیبوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ ایسے محاورے جیسے ناک کا بال ہونا، تھوک کر چاٹنا۔ پیشاب میں سے مچھلیاں پکڑنا تو میں برداشت بھی نہیں کر سکتا۔ اردو زبان کا چٹخارہ میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ میں نے اردو زبان میں چٹخارہ کہیں نہیں دیکھا۔ رہی یو۔پی کی اردو تو وہ موجودہ اردو کی نانی تھی، وہ دلی میں پیدا ہوئی۔ لکھنؤ میں جوان ہوئی اور حیدر آباد دکن میں فوت ہو گئی۔ اس کی اکلوتی لڑکی نے پنجاب کے ایک گبرو جوان سے شادی کر لی، جو مکئی کی روٹی اور ساگ کا دلدادہ تھا۔ اس طرح اردو سادہ ہو گئی اور بناوٹوں سے پاک ہو گئی۔ میں تو جو بات کہنا چاہتا ہوں، اس کو چبائے بغیر دوسرے کے سامنے پھینک دیتا ہوں۔"

دیوانہ دریا بُردی پھر طیش میں آگیا اور بنچ پر بیٹھ گیا اور زور زور سے بولنے لگا" تم نے ہمارے کلاسیکی ادب کی توہین کی ہے۔ میں تمھیں مشورہ دیتا ہوں کہ اگر تم ادب میں زندہ جاوید رہنا چاہتے ہو تو ہمارے کلاسیکی ادب کا مطالعہ کرو۔"

میں نے جواب دیا" تخلیقی کام کرنے والوں کو کلاسیکی ادب کے مطالعے کا وقت کہاں ہوتا ہے۔ کلاسیکی ادب کا مطالعہ ادبی مؤرخوں کا کام ہے جو بعد میں ترقی کر کے ادبی نقاد بن جاتے ہیں اور ادیبوں کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ تخلیقی کام ہول ٹائم جاب ہے۔ تخلیق صرف تخلیق کی اجازت دیتی ہے۔ کسی دوسرے کام کی اجازت نہیں دیتی۔ تخلیقی ادیب اگر تخلیق کے علاوہ کوئی اور کام مثلاً کلاسیکی ادب کا مطالعہ وغیرہ بھی کر سکتے ہوں تو اسی نسبت سے ان میں تخلیقی قوتیں کم ہوتی ہیں۔ تخلیقی ادب پیدا کرنے والوں کا ماضی سے کوئی تعلق

نہیں ہوتا۔ ان کے مطالعے کا میدان ہے حال اور مستقبل میں پھیلا ہوا ہے۔ اور یہ اتنا وسیع، سرسبز اور خوشگوار میدان ہے کہ اس کو چھوڑ کر کلاسیکی ادب کے تاریک اور بدبودار ریکارڈ روم میں جھانکنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ آپ اپنی مثال لیجئے۔ آپ نے کلاسیکی ادب کا مطالعہ کیا ہے، اتنا مطالعہ کیا ہے کہ آپ صرف غزل کے قابل رہ گئے ہیں۔"

دیوانہ دریابردی کی دیوانگی کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ پہلے پیلا ہوا پھر سرخ ہوگیا اور پھر نیلا ہو گیا اور قریب تھا کہ وہ اپنے کلاسیکی ادب کی پوری طاقت سے مجھ پر حملہ کر دیتا کہ سرخ رنگ کی ایک خوبصورت کار ہمارے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ اور اس میں سے سابق آرٹسٹ رمزی نے نکل کر مجھے کہا۔

"ہیلو کمانڈر۔"

میرے بے لوث عزیز دوست جو تعداد میں بہت کم ہیں مجھے بڑے پیار سے پڑے پرخلوص لہجے میں کمانڈر کہتے ہیں۔ اور ان کا مطلب ہوتا ہے کہ تم کمانڈر شمانڈر کچھ نہیں ہو۔ ہمارے دوست ہو۔ ہمارے پاس بیٹھو۔ ہمارے ساتھ باتیں کرو۔ لیکن جب سابق آرٹسٹ رمزی یا ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری یا پروفیسر ممتاز حسین مجھے کمانڈر کہتے ہیں تو ان کا مطلب ہوتا ہے کہ میاں تم افسانہ نگار وغیرہ کچھ نہیں ہو۔ تم صرف کمانڈر ہو۔ اپنا کام کرو۔

اب سابق آرٹسٹ رمزی سے تو مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور پروفیسر ممتاز حسین کے خلاف میں نے جوابی حملوں کا انتظام کر لیا ہے۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں آئندہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو صرف ڈاکٹر کہوں گا اور پروفیسر ممتاز حسین کو صرف پروفیسر۔ اس طرح بہت سے لوگ ڈاکٹر سے مویشیوں کا ڈاکٹر سمجھیں گے اور پروفیسر سے پروفیسر کوکب یا پروفیسر ساری اور اگر وہ پھر بھی باز نہ آئے تو پھر میں ایک دن ان کے سامنے کھڑا ہو کر اعلان کر دوں گا کہ میں بغیر کسی شک وشبہ کے ایک مکمل افسانہ نگار ہوں اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میں تنقید نگار نہیں ہوں۔

میں نے آرٹسٹ رمزی کو سابق آرٹسٹ کہا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آرٹسٹ رمزی مصور ماضی ہے۔ اور وہ ہمارے ماضی کے آرٹ کا نمائندہ ہے۔ جس طرح چغتائی آرٹ۔ چغتائی آرٹ ماضی کا آرٹ ہونے کے باوجود حال اور مستقبل کا آرٹ بھی ہے۔ کیونکہ وہ زندہ جاوید ہے۔ سابق آرٹسٹ رمزی سے

میری مراد یہ ہے کہ وہ کسی وقت میں آرٹسٹ ہوتا تھا اب وہ موٹروں کا دلال ہے۔

رمزی نے خوبصورت سرخ کار میں سے نکل کر کہا۔ "ہیلو کمانڈر!" ــــ "ہیلو دیوانے!"

دیوانہ دریابردی نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ "دیوانے نہیں۔ دیوانہ دریابردی!"

رمزی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "حضرت دیوانہ دریابردی! آپ کے تخلص کے ساتھ یہ بڑی ٹریجڈی ہے کہ گفتگو میں اور سٹیٹمنٹ میں دیوانہ اکثر دیوانے بن جاتا ہے۔ مثلاً دیوانے نے غزل پڑھی۔ دیوانے نے حجامت کروائی۔ اگر کہا جائے دیوانہ نے غزل سنائی اور دیوانہ نے حجامت بنوائی تو یہ غلط گرامر ہے۔"

پھر رمزی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کمانڈر! یہ کار پسند ہے؟ بڑی سستی مل رہی ہے۔ ٹیسٹ کر رہا ہوں۔ اچھی سروس دے رہی ہے۔ پندرہ میں مل جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "جناب میرے پاس پندرہ ہزار روپے کہاں ہے۔"

اس نے مشورہ دیا۔ "اچھا میں یہ کار خرید لیتا ہوں۔ تم دس میں میری کار خرید لو۔ اوکے چیریو۔"

اس نے کار سٹارٹ کر لی۔

دیوانہ دریابردی نے جلدی سے کہا۔ "بھئی مجھے بھی ساتھ لے چلو۔"

سابق آرٹسٹ رمزی اور دیوانہ دریابردی چلے گئے۔

اچھا ہوا میں اکیلا رہ گیا۔ کچھ دیر پہلے ٹیڈی لڑکیوں کا ایک غول آیا تھا۔ میں ان کو غور سے دیکھنا چاہتا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکی اپنے ٹیڈی ڈریس کے باوجود بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک سوٹ کیس تھا۔ اس سوٹ کیس کے بوجھ سے اس کے جواں سال جسم کے سڈول حصوں میں قیامت کا تناؤ پیدا ہو گیا تھا اور وہ اس کے تنگ لباس کو پھاڑ کر باہر نکلے پڑتے تھے۔

لیکن کیا میں اس لڑکی کے جسم کو دیکھ رہا تھا؟

نہیں میں اس ٹیڈی گرل کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں اس سوٹ کیس کو دیکھ رہا تھا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ لڑکیاں کلفٹن کے ساحل سے پلٹنگ کر کے آئی تھیں اور اس سوٹ میں غالباً ان لڑکیوں کے سوئمنگ سوٹ بند تھے۔ پھر میں اس سوٹ کیس کو غور سے کیوں دیکھ رہا تھا۔

یکایک اس سوٹ کیس میں اور اس شخص میں رشتہ پیدا ہو گیا، جس کو میں دیر سے پہچاننے کی کوشش

کر رہا تھا۔ میں نے اس کو پہچان لیا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے مجھے سوٹ کیس دیا تھا۔

میں لاہور کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میری پکچر فیل ہو گئی تھی۔ پروڈیوسر نے میرا معاوضہ دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ میرے پاس ہوٹل کا بل ادا کرنے اور کراچی کے ٹکٹ کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ اس دن شام کو یہ شخص میرے پاس آیا۔

اس نے کہا۔ "میں آج کراچی جا رہا تھا۔ لیکن کسی خاص وجہ سے مجھے یہاں رکنا پڑ گیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کراچی جا رہے ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو آپ میری جگہ اس ٹکٹ پر سفر کیجئے۔ یہ لاہور سے کراچی تک سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ ہے اور یہ ایک ہزار روپیہ آپ کے ضروری اخراجات کے لئے ہے۔ اس سفر کو ملتوی کرنے میں ہماری فرم کا لاکھوں کا نقصان ہے۔"

اس نے ٹکٹ اور ایک ہزار روپے کے نوٹ میرے سامنے رکھ دیئے اور اٹھ کر جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ جاتے ہوئے اس نے کہا۔ "اب میں آپ سے رات کے دس بجے پلیٹ فارم پر ملوں گا۔ ایک آدمی ایک سوٹ کیس لائے گا۔ میں اس کو آپ کے کمپارٹمنٹ میں رکھوا دوں گا، کراچی سٹیشن پر اسی قسم کا ایک آدمی آ کر یہ سوٹ کیس اٹھا کر لے جائے گا۔ آپ ان دونوں آدمیوں سے کوئی بات نہ کیجئے اور اگر راستے میں اس سوٹ کیس کے بارے میں کوئی تفتیش ہو جائے تو آپ کہیں گے کہ یہ سوٹ کیس آپ کا نہیں۔ اور ہم دونوں کے بارے میں آپ مکمل لاعلمی ظاہر کریں گے۔"

اس کی جلدی نے اور میری مالی حالت نے مجھے سوچنے کا موقع نہ دیا۔

اچھا! یہ ہے وہ آدمی!

سامنے سے این۔ ڈی۔ انصاری آتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ساتھ وہی سفید ریش بوڑھا تھا جو میں نے جونا مارکیٹ میں مسجد سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ اس نے میلے ملیشیا کے کپڑے پہنے ہوئے تھے لیکن اس کا جوتا نیا نہیں تھا۔

این۔ ڈی۔ انصاری نے تعارف کرایا۔ "ان سے ملئے یہ مغربی پاکستان میں سب سے بڑے جیب تراش ہیں۔"

پھر اس نے بوڑھے سے مخاطب ہو کر کہا۔ "فرہاد خان، ان کا بٹوا اور رہن دے دو۔"

فرہاد خاں نے میرا بٹوا اور پین دے دیا۔ میرا بٹوا عید کی نماز کے بعد مسجد سے نکلتے ہوئے ہجوم میں گم ہو گیا تھا اور یہ پین بس میں کسی نے نکال لیا تھا۔

انصاری نے کہا " فرہاد خان، اب تم جاؤ "

فرہاد خان چلا گیا۔ انصاری میرے پاس بیٹھ گیا۔

میں نے کہا " انصاری، یہ کیا؟ "

اس نے جواب دیا " جس دن فرہاد خاں نے آپ کا بٹوا اور پین نکالا ہے، گینگ کے ساتھ میری ڈیوٹی تھی۔ یہ چیزیں اسی دن سے میرے پاس محفوظ پڑی تھیں۔ پچھلی دفعہ جب آپ کی مجھ سے ملاقات ہوئی ہے میں آپ کو یہ بتانے کی جرأت نہ کر سکا کہ آپ کی چوری میرے سامنے ہوئی۔ پھر جب آپ نے مجرموں کی زندگی سے دلچسپی کا اظہار کیا تو یہ میرے لئے آسان ہو گیا "

میں نے پوچھا " پھر تم پچھلی ملاقات میں یہ چیزیں واپس کیوں نہ کیں "

" اس وقت آپ کے بٹوے کے پیسے مجھ سے خرچ ہو گئے تھے۔ آج آپ کو یہاں دیکھ کر میں یہ چیزیں ابھی ابھی لے کر آیا ہوں "

میں نے دیکھا کہ انصاری کے ذہن پر یہ باتیں گراں گزر رہی ہیں۔ اس لئے میں نے موضوع بدل دیا۔

میں نے کہا " اب میں سمجھا کہ تم نے اپنی صورت کیوں بدل رکھی ہے "

اس نے کہا " بنیادی جمہوریت کا نمائندہ چنا جانے کے بعد میں اپنی اصلی صورت کی طرف واپس آنے ہی والا تھا کہ ہماری یونین میں تنسیخ عائلی قوانین کمیٹی قائم ہو گئی اور مجھے اس کا صدر چن لیا گیا چنانچہ مجھے اپنی موجودہ ہیئت جاری رکھنی پڑی۔ مجھے عائلی قوانین کے خلاف تقریریں کرنی پڑتی ہیں اور ان کی مذمت میں عورتوں کے جلوس تنظیم دینے پڑتے ہیں۔ اس میں رشوتوں کے علاوہ یہ ہیئت کذائی بھی بہت کام آتی ہے "

" ارے، نور دین، تم عائلی قوانین کے خلاف بھی کام کر رہے ہو۔ یہ تو بڑی حماقت ہے۔ عائلی قوانین تو عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے بنے ہیں۔

" مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔ یہ قوانین سب عورتوں کی حفاظت نہیں کرتے۔ ان عورتوں کو ان

قوانین سے سخت نقصان پہنچا ہے جن میں کوئی نہ کوئی نمایاں نقص ہو۔ ان بے چاروں کی شادیاں صرف ان مردوں سے ہو سکتی ہیں جن کی پہلے شادیاں ہو چکی ہوں، عائلی قوانین نے ان کی شادیوں کے چانس بالکل ختم کر دیئے ہیں۔ چنانچہ میں اس وقت تک ایسی عورتوں کے چالیس جلوس نکلوا چکا ہوں۔ ان میں وہ عورتیں بھی شامل ہو جاتی جن کے شوہروں نے چار چار شادیاں کر رکھی ہیں۔ کیونکہ وہ چاہتی ہیں کہ وہ مصیبت میں پھنسی ہیں تو سب مصیبت میں پھنس جائیں۔"

میں نے کہا "میں یہ ہرگز ماننے کے لئے تیار نہیں کہ عائلی قوانین نے کسی کو نقصان پہنچایا ہے۔"

اس نے کہا "مجھے پہنچایا ہے۔ میری ایک مالدار بوڑھی عورت سے دوسری شادی ہونے والی تھی کہ عائلی قوانین آ گئے اور میرا دولت مند ہونے کا چانس مارا گیا اور اس عورت کا شادی کا چانس مارا گیا۔ اب ادھر وہ عورتوں کو عائلی قوانین کے خلاف بھڑکا رہی ہے۔ ادھر میں آدمیوں کو ان کے خلاف اکسا رہا ہوں اور اس سلسلے میں ہم دونوں کے لیڈری کے چانس بھی چمک اٹھے ہیں۔"

یکایک کالے رنگ کی ایک بہت بڑی چمکدار کار کے ہارن نے سب کو چونکا دیا۔ وہ کار تقریباً درمیان میں آ کر رک گئی۔ اس کار میں سے ایک لمبا تڑنگا شاندار آدمی نیلے رنگ کے سوٹ میں اور گہرے رنگ کا چشمہ لگائے ہوئے باہر نکل کر کار کے پاس کھڑا ہو گیا اور ہجوم کو غور سے دیکھنے لگا۔

انصاری پہ سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ وہ دیر تک نیلے سوٹ والے آدمی کو دیکھتا رہا۔

آخر میں نے پوچھا "انصاری کیا بات ہے؟"

انصاری چپ چاپ نیلے سوٹ والے آدمی کو دیکھتا رہا۔

میں نے پھر پوچھا "کیا بات ہے انصاری؟"

انصاری نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر نہایت مدھم آواز میں مجھ سے بولا "آج یہاں بڑے خوفناک واقعات پیش آنے والے ہیں۔"

"کیا؟"

"قتل!"

"کس کا؟"

"زیادہ سوال مت کیجئے۔"

"یہ کون ہے؟"

"گینگ کا سردار۔"

میں نے اٹھ کر کہا "میں جا رہا ہوں۔"

اس نے اسی رازدارانہ مدھم آواز میں کہا "نہیں آپ کو آج رات کی گاڑی سے پشاور جانا ہے۔ ایک آدمی سٹیشن پر ایک سوٹ کیس لے کر آئے گا۔ ایسا ہی ایک آدمی اس کو پشاور سٹیشن پر اتارے گا۔ دونوں آدمیوں سے کوئی بات نہ کیجئے۔ راستے میں سوٹ کیس کے بارے میں کوئی تفتیش ہو جائے تو کہئے کہ سوٹ کیس آپ کا نہیں۔"

میں گھبرا گیا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا "انصاری، نہیں۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔ مجھے جرائم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں مجرموں کی زندگی کا مطالعہ نہیں کرنا چاہتا۔"

اور میں اٹھ کر جلدی جلدی نئی کلفٹن کی طرف بڑھ چل پڑا۔

فراق گورکھپوری

اے مادرِ ہند!

رباعیات

گہرا ہر قوم سے ترا ناطہ ہے
ہم پہ ہی نہیں ماں تجھے پیار آتا ہے
اوروں کا بھی حق ہے ممتا پر تیری
سنتے ہیں ترا نام جگت ماتا ہے

یہ ہے تری چاندنی کہ امرت کی پھوار
شبنم کی شبوں میں گونجتی ہے جھنکار
آواز میں ٹھنڈکیں کھنکتی ہیں کہ ہے
ندیوں کا جل ترنگ تیری گفتار

معنی بعید میں وہ تیری تادیب
سنتے ہیں کہ جاگ اٹھے تھے دھرتی کے نصیب
محراب ہفت افلاک کے نیچے تیرے
قدموں کے ہیں نقش یا بنائے تہذیب

ہر سو یہ سنسناہٹیں کس کی ہیں؟
پردوں میں یہ جگمگاہٹیں کس کی ہیں؟
جھلمل یہ ہوائیں ہیں کہ ملبوس ترا
کانوں میں یہ سرسراہٹیں کس کی ہیں؟

آکاش کے مندر میں ترا درشن ہے
سینے میں چراغ سرمدی روشن ہے
رخساروں میں پہلی صبح کی نرم دمک
مکھڑے پہ ترے عجب سہاناپن ہے

دُنیا ہے قائلِ نگاہِ جُز رس
ہے روح نسیمِ خلد ہر موجِ نفس
تو سامانِ سکونِ کربِ ہستی
ہاتھوں میں ترے وہ جس ہے آنکھوں میں وہ رس

تانیں ہر ساز کی یہیں ٹوٹی ہیں
صد گنج خوشی کی منزلیں چھوٹی ہیں
وہ قلبِ دوام کی تہیں تھیں جن سے
تیری تہذیب کی جڑیں پھوٹی ہیں

سردار جعفری

چار نظمیں

ترے پیار کا نام

دل پہ جب ہوتی ہے یادوں کی سنہری بارش
سارے بیتے ہوئے لمحوں کے کنول کھلتے ہیں
پھیل جاتی ہے ترے حرفِ وفا کی خوشبو
کوئی کہتا ہے مگر روح کی گہرائی سے
شدّتِ تشنہ لبی بھی ہے ترے پیار کا نام

اجنبی آنکھیں

ساری شامیں اُن میں ڈوبیں
ساری راتیں اُن میں کھوئیں
سارے ساغر اُن میں ٹوٹے
ساری مے
غرق اُن آنکھوں میں ہے
دیکھتی ہیں وہ مجھے لیکن بہت بیگانہ وار

چاند کو رخصت کر دو

میرے دروازے سے اب چاند کو رخصت کر دو
ساتھ آیا ہے تمھارے جو تمھارے گھر سے
اپنے ماتھے سے ہٹا دو یہ چمکتا ہوا تاج
پھینک دو جسم سے کرنوں کا سنہری زیور
تم ہی تنہا مرے غم خانے میں آ سکتی ہو
ایک مدت سے تمھارے ہی لئے رکھا ہے
میرے جلتے ہوئے سینے کا دہکتا ہوا چاند
دلِ خوں گشتہ کا ہنستا ہوا خوش رنگ گلاب

تمھارے ہاتھ

تمھارے نرم حسیں، دلنواز ہاتھ نہیں
مہک رہے ہیں مرے ہاتھ میں بہار کے ہاتھ
مچل رہی ہیں ہتھیلی میں اُنگلیوں کی لویں
تڑپتی نبض کہے جا رہی ہے پیار کی بات
پگھل رہی ہے رُخِ آتشیں پہ ہجر کی شام
نکل رہی ہے سیہ زلف سے وصال کی رات

اخترالایمان

اعتماد

بولی خودسر ہوا ایک ذرہ ہے تو
یوں اڑا دوں گی میں، موجِ دریا بڑھی
بولی میرے لئے ایک تنکا ہے تو
یوں بہا دوں گی میں، آتشِ تند کی
اک لپٹ نے کہا میں جلا ڈالوں گی
اور زمیں نے کہا میں نگل جاؤں گی
میں نے چہرے سے اپنے الٹ دی نقاب
اور ہنس کر کہا، میں سلیماں ہوں
ابنِ آدم ہوں میں یعنی انساں ہوں!

جبر

زرد پتّوں کا وہی ڈھیر، وہی دورِ خزاں
خشک شاخیں ہیں ابھی منتظرِ فصلِ بہار
مرگ انبوہ سے کچھ کم تو نہیں ہے یہ سماں
کتنا جانکاہ تسلسل ہے، وہی لیل و نہار

اس قدر ناز نہ کر پھول سے رخساروں پر
زندگی بھیک ہے، جو جبرِ مشیت سے ملی
حسن بے مایہ ملا تجھ کو، مجھے تشنہ دلی
ہم بھکاری ہیں، بھکاری کی حقیقت کیا ہے
ایک کشکولِ گدایانہ لئے پھرتے ہیں
منظرِ عام پہ، ویرانوں میں آبادی میں
سب ہی بے بس ہیں، سبھی ہونٹ سئے پھرتے ہیں

اپنی مجبوری کا شاید تجھے احساس نہیں
ایک دھندلی سی کرن بھی نہ ملے مانگے سے
لب ہلائیں تو یہ سورج، یہ قمر بھی چھن جائے
ہاتھ اٹھائیں تو دعاؤں سے اثر بھی چھن جائے
اشک چھن جائیں نگاہوں سے حرارت چھن جائے
ظلم پروردہ جوانی سے محبت چھن جائے
حسن اک ٹیس کی صورت میں بدل کر رہ جائے
ظلمتِ یاس میں اک آہ مچل کر رہ جائے!

احمد ندیم قاسمی

بے بسی

خدا سے عقل نہ ملتی تو کیا پڑی تھی مجھے
کہ اقتدار کی نیت کا تجزیہ کرتا
رگوں میں خون کی گرمی کا معجزہ ہے تمام
وگرنہ آدمی پتھر سے مختلف تو نہ تھا
یہ سب گدازِ دل و ذہن کا نتیجہ ہے
کہ عمر بھر میں کسی کے لیے اداس رہا
خدا نے مجھ کو بصارت اگر نہ دی ہوتی
تو حسن مجھ پہ بھلا اتنے حشر کیوں ڈھاتا
فقط شعورِ تناسب ہے اور جمال ہے نام
یہ صرف لمس کی حسرت ہے ورنہ عشق ہے کیا
مجھے اڑان مری قوتِ خیال نے دی
وگرنہ میرا ستاروں سے کیا تعلق تھا
تو میری فکر میں جلتے ہوئے الاؤ تو دیکھ
برا نہ مان مری تیز و تند باتوں کا
زباں ملی تو مجھے بولنا پڑا، ورنہ
خدا کی طرح میں تا روزِ حشر چپ رہتا

شاذ تمکنت

پیاس

کبھی رخصت ہوئے مل بیٹھ کے، ہنس بول کے تم
پھر وہی یاد، وہی دید کی حسرت، وہی پیاس
(یہ مری گونجتی تنہائی، یہ میرا بن باس)

تم مرا راز ہو، سانسوں میں رہو، دل میں بسو
تم مرا گیت ہو، ہر ساز پہ گا لوں گا تمھیں
روز کھوتا ہوں مگر مہرِ جہاں تاب کی طرح
کہ صبح دم، در و بام پہ پا لوں گا تمھیں
اب جو دیکھوں گا تو بس دیکھتا رہ جاؤں گا
اب ملو گے تو نگاہوں میں چھپا لوں گا تمھیں

جانِ شاعر تمھیں اب تک نہیں دیکھا میں نے
آنکھ بھر کر تمھیں اب تک نہیں دیکھا میں نے

ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے یہ ممکن بھی نہ تھا

احمد فراز

مَیں اور تُو

روز جب دھوپ پہاڑوں سے اُترنے لگتی
کوئی گھٹتا ہوا بڑھتا ہوا بیکل سایہ
ایک دیوار سے کہتا کہ مرے ساتھ چلو

اور زنجیرِ رفاقت سے گریزاں دیوار
اپنے پندار کے نشے میں سدا استادہ
خواہشِ ہمدمِ دیرینہ پہ ہنس دیتی تھی

کون دیوار کسی سائے کے ہمراہ چلی؟
کون دیوار ہمیشہ مگر استادہ رہی؟
وقت دیوار کا ساتھی ہے نہ سائے کا رفیق

اور اب سنگ و گل و خشت کے ملبے کے تلے
اسی دیوار کا پندار ہے ریزہ ریزہ
دھوپ نکلی ہے مگر جانے کہاں ہے سایہ

زبیر رضوی

پاسِ وفا

مرے محبوب کب تک اعتبارِ وعدۂ فردا
میں اپنی خلوتوں میں گوش بر آواز ہوں کب سے
نہ جانے کب تری آواز کے گھونگھرو چھنک اٹھیں
نہ جانے کب تو زنجیرِ درِ دل آ کے کھٹکائے
حریمِ شوق میں تو جانے کب دیوانہ وار آئے

بہت دن بعد میں شہرِ طرب کی سمت آیا ہوں
ہر اک شے خوش ہے مجھ کو پھر سے اپنے درمیاں پا کر
مرے احباب کو دکھ تھا مری گوشہ نشینی کا
مجھے سب دیکھ کے مسرور ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں
غمِ دل سے اجازت مل گئی اس سمت آنے کی؟

چلو گھومیں پھریں، شادابیِ حسنِ جہاں دیکھیں
کہیں بیٹھیں، پئیں، شعر و ادب کی زلف سلجھائیں
بہت دن بعد دیکھا ہے طلوعِ جام کا منظر
بہت دن بعد آنکھیں نشۂ صہبا میں ڈوبی ہیں
کوئی میخوار پیمانہ بکف مجھ سے یہ کہتا ہے
تم اپنی خلوتوں کو کیوں اکیلا چھوڑ آئے ہو
صدائے آشنا دہلیز پر دستک نہ دیتی ہو
حدودِ شوق میں دیوانگی تنہا نہ بیٹھی ہو

حسرت جے پوری

یاد

جب کبھی تیری محبت کا خیال آتا ہے
میں تیری یاد کے طوفان میں کھو جاتا ہوں

جب تیرا حسن ابھرتا ہے اجالا بن کر
تجھ سے مل جانے کے ارمان میں کھو جاتا ہوں

زندگی درد کی راہوں پہ کھڑی ہے کب سے
تو چلی آئے تو اس دل کو قرار آ جائے

یہ دھواں دھار فضا اور چھلکتی وادی
آ کے آنکھوں سے پلا جا کہ خمار آ جائے

دل دھڑکتا ہے میرا شام کے تارے کی طرح
پیار کا گیت ترے دل کو سنانے کے لئے

تو بھی بے چین تو ہو گی کسی گھائل کی طرح
مانگتی ہو گی مرادیں مجھے پانے کے لئے

مجھ سے تو دور سہی پھر بھی میرے پاس تو ہے
شیشۂ دل میں تو ہی شوخ پری رہتی ہے

میں تری یاد میں جس وقت بھی رو لیتا ہوں
میری آنکھوں میں بہاروں کی تری رہتی ہے

صرف مجھ تک ہی نہیں مرے جنوں کا عالم
تو بھی رہ رہ کے میرے غم میں تڑپتی ہو گی

ڈھونڈتی ہوں گی نگاہیں تیری رادھا بن کر
میرے دیدار کو دن رات ترستی ہو گی

جب کبھی تیری محبت کا خیال آتا ہے

حمید الماس

نہ ستائش کی تمنّا...

ندا آئی
انبوہِ شیدائیاں
نازنینانِ شہرِ تخیّل
غزالانِ فکر و نظر
غمگسارانِ دار و صلیب و رسَن
بڑی دیر سے
عقیدت کی نایاب سوغات لے کر
درِ گنبدِ فن پہ سجدہ کناں ہیں

پئے دیدنِ منظرِ شادکاماں
بڑی تمکنت سے اٹھا، اٹھ کے میں نے
جو دیکھا تو حدِ نظر تک نبردِ کش
لہو کی لکیروں کا اک کارواں تھا
کبھی جو رگ و پے میں میری رواں تھا!

فہمیدہ ریاض

اندیشہ

ہاتھ میں بیتی بات کی لرزش
لاکھ چھپاؤں، کھنکے برتن
گھٹی گھٹی مجبوری میری
سب کے طعنے، دل کی کھولن
امیدوں کی راکھ میں دہکیں
جلتی حسرت کے انگارے
رخ پہ ڈھلکے عرقِ ندامت
کہنا چاہوں، چپ رہ جاؤں
ہائے اس کی کھوئی محبت
گال پہ کاجل پھیلا پھیلا
محرومی سے اجڑی صورت
رسوائی سے آنچل میلا
چپکے چپکے آنسو پونچھوں
ہنس ہنس، میں روتی کب ہوں
اس کا مجھکو دھیان کہاں ہے
مجھ پر تم انگلی نہ اٹھاؤ
یہ گیلی لکڑی کا دھواں ہے

کمار پاشی

آکاش میں شبد

تو کیا میرے بارے میں تم بھی یہی سوچتی ہو؟
ہزاروں برس کی رفاقت غلط
میں نے مانا
کہ لمحوں کے جادو کا سنگیت میں نے سنا ہے

مگر اس سمندر سے پوچھو
جسے ایک ہی گھونٹ میں پی گیا تھا
اگر دیکھنا چاہتی ہو
تو رخسار پر چاند کے
میرے بوسے کا مدھم نشان
آج بھی میری جرأت پہ ہیبت زدہ ہے

اگر ہو سکے تو
کسی تیز خنجر سے نس نس مری کاٹ دو
(اور لہو سارا صحراؤں کو بخش دو)

اور سنو! اک لطیفہ سنو
جب مری لاش پر رقص کرتے ہوئے
تھک کے گرنے لگو گی
تو خود کو میرے بازوؤں میں تڑپتا ہوا پاؤ گی

ڈاکٹر اعجاز حسین

شاعری میں عظمتِ گناہ

شاعری کی نفسیات پر غور کرتے وقت اس کے مزاج میں ایک ایسا عنصر بھی ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض گناہوں سے اسے خاص دلچسپی رہی ہے۔ ان گناہوں پر بجائے اظہار ندامت کے جذبۂ تفاخر و احساس انبساط طاری ہوتا ہے۔ اس مذاق کے اسباب تلاش کرنے میں جب ہم انسانی ذہن و شعور کی تہوں کو ٹٹولتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان اپنے وجود کے ساتھ ہی متضاد خواص ساتھ لے کر آیا، خوف و شجاعت، احترام و سرکشی، اطاعت و بغاوت اور اسی قسم کے ان گنت جذبات اس کے ذہن کی تشکیل میں کام آئے۔ اس کی ایک شخصیت بیک وقت کئی حیثیتوں کی نمائندہ و مظہر ہے۔ ماضی کے اس دھندلکے پر نظر ڈالیے جب وہ ارتقائی منزلیں طے کر رہا تھا، تہذیب و تمدن کی قید و بند سے آزاد تھا۔ نہ اس کے گھر تھا نہ کھانے کا سامان ایسی حالت میں وہ بجلی کی کڑک، بادل کی گرج، ہر ایک خوفناک مظہر و عظیم منظر کے سامنے سر جھکا لیتا تھا اس کا احترام کرتا تھا کیونکہ صورت فرار نہ تھی، لیکن ان ہی سب آفات و واقعات میں وہ اپنے عنصر میں خوفناک سمندروں، بھیانک غاروں، سربلند پہاڑوں سے مقابلہ کرتا، ٹکر لیتا فاتحانہ انداز سے آگے بڑھتا تھا، کبھی خوف و ہراس سے دہل کر ٹھٹھک کے رہ جاتا کبھی قدرت سے بغاوت کر کے پہاڑ توڑتا اپنا راستہ بناتا زندگی کے ہچکولوں میں گرتا پڑتا اس جگہ پر پہنچتا جہاں رسائی ناممکن تھی۔

اس نے ضروریات کے سانچے میں اپنے طور پر کچھ قاعدے بنائے کچھ اپنے فائدے کے لئے کچھ ساتھیوں کے۔ یہ قاعدے بنتے بگڑتے رہے۔ ہر قبیلہ اپنے فائدے اور ضروریات کے لئے دستور مرتب کر لیتا خواہ وہ کسی کے موافق ہوں یا مخالف۔ اس مخلوق نے اپنے خالق بھی بنائے۔ آسمان، زمین، آفتاب، ماہتاب، بعض درخت، کچھ جانور بھی اس کے ذہن پر جبار و قہار، رحمان و رحیم ہو کر مسلط ہوئے۔ غرض کہ جاہلی کی زمانہ میں

یادِ ایام کہ بے رنگ تھی تصویرِ جہاں
دستِ مشاطہ نہ تھا محرمِ زلفِ دوراں

اس بے رنگی و بے ربطی پر پیدا کرنے والے کو رحم آگیا۔ اس نے رہنمائی کے لئے انبیا بھیجے۔ پیغمبر و ہادی دُنیا میں روانہ کئے کہ اخلاق کی بنیادیں قائم کریں۔ خانہ بدوشوں کو متمدن بنائیں۔ مل جُل کر رہنا سکھائیں۔ چنانچہ ان برگزیدہ ہستیوں نے اپنے زمانے کے اعتبار سے قانون جاری کیے۔ لوگوں نے ان کی عظمت اور روحانی حالت کا اعتراف کیا۔ ان کے فرمان کے آگے سر جھکایا۔ مگر ہر زمانے میں ہر ہادی و پیمبر کے سب ہی معتقد نہ ہوئے۔ کچھ لوگ خلاف بھی رہے۔ انسان کے جذبے نے مخالفت و بغاوت پر بھی آمادہ کیا۔ وہ اپنے بنائے ہوئے خدا اور دستور کو چھوڑنا گناہ سمجھتے رہے۔ رہنماؤں کے بتائے ہوئے راستے کا مذاق اڑاتے رہے اور کبھی کبھی تو یہ مخالفین اپنے ہی کو خدا سمجھنے سمجھانے لگے۔ کچھ لوگ ان پر ایمان بھی لائے وہ انھیں خود ساختہ خداؤں کے جذبۂ عبودیت سے سرشار ہو کر برگزیدہ انبیا سے جنگ کرتے رہے۔ موقع پا کر انھیں ہلاک بھی کر دیتے۔ غرض کہ مذہب سے انحراف و بغاوت کا جذبہ پیدا ہوتا رہا۔ انسان تقلید و تنقید کی دنیا آباد کرتا اپنی نوعیت و انفرادیت کا اعلان کرتا ہوا تہذیب و تمدن کی راہ طے کر رہا تھا۔ اسی میں سے کچھ خاص لوگ فن و ادب سے دلچسپی لینے لگے۔ لطافت و ذہانت۔ علم و شعور کی فضا میں وہ جنگ و جدل نہ رہی جو اب سے پہلے کُشت و خون کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ اس میدان میں بجائے تلوار کے قلم سے زیادہ کام لیا گیا۔

ایک ہی مذہب کے لوگ جب اپنی مقدس کتاب کے الفاظ پر غور کرنے لگے تو تفسیر و تعبیر میں علمی اختلافات بھی پیدا ہوئے۔ رفتہ رفتہ یہ تنازعات کی صورت میں آنے لگے۔ تلواروں سے بھی مقابلہ ہوا اور قلم بھی خونچکاں نظر آیا۔ اسلام ہی کی مثال لے لیجئے ہر فرقہ کا ایمان قرآن شریف پر ہے۔ اس کے الہامی و ربانی کتاب ہونے میں کسی کو شبہ نہیں مگر تفسیر و تعبیر میں الفاظ کے معنی اور عبارت کے مفہوم میں علمائے دین کے درمیان اتنا اختلاف ہو گیا کہ مسلمانوں نے نہ جانے کتنے فرقے ہو گئے۔ اصول دین میں زیادہ تر فرقے متفق الرائے ہے لیکن لیکن فروغ دین کے اختلافات معاذاللہ! یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کسی فرقے کے علما سب جاہل و غلط گو تھے جن کی وجہ سے اختلافات رونما ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیشتر علمائے دین صاحبِ علم و پرخلوص بزرگ تھے صرف نظریات و خیالات کے فرق نے کسی کو ایک راستے پر چلنے پر مائل کیا اور کسی کو

دوسری طرف لے گیا۔ حسب استعداد قریب قریب سبھی نے تجانی سے کام لینے کی کوشش کی لیکن مبلغ علم نے ایک ہی راستے پر چلنے کی سب کو اجازت نہ دی۔ جس کی نظر میں جو حقیقت زیادہ اہم نظر آئی اس نے اس کی تبلیغ کی فکر کی۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ اسلام کس طرح پھیلا، یا اس میں رخنہ اندازی کے اسباب کیا تھے، غرض کرنا صرف یہ ہے کہ ایک ہی نبی کے ماننے والے بھی علاوہ اور باتوں کے مذہبی امور پر جھگڑتے رہے ہیں۔ منجملہ دیگر وجوہ کے اس لڑائی کی سب سے بڑی وجہ وہ خصوصیت تھی جو انسان روزِ ازل سے مختلف خواص کے ساتھ لے کر آیا تھا۔ یہ خصوصیت چاہے کتنی ہی شائستہ تہذیب ہوئی ہو لیکن اس کا بنیادی مادّہ اب تک باقی ہے۔

اختلاف و اتفاق سے انسان کی زندگی بنی تھی۔ ہر شخص حسب ظرف ضبط و علم کی باتیں سن کر اپنی رائے قائم کرنے کا مادّہ رکھتا تھا۔ کچھ مخصوص اشخاص (صاحب علم و نظر) بھی ان باتوں کے ماننے میں تکلف محسوس کرتے تھے جو اُن کی رائے میں صحیح نہ ہونی چاہئیں خواہ کتنے ہی پر زور طریقہ سے کسی عالم نے بیش کی ہوں۔ یہ انداز فکر زبان سے گزر کر ضبطِ تحریر میں آتا رہا، شعراء و ادیب اپنے اپنے طور پر متاثر ہو کر اشعار و عبارات میں قلم بند کرتے رہے۔

شاعروں کی کاوش کو مذہب نے کبھی پسندیدہ نگاہوں سے نہ دیکھا۔ علماء شاعروں کو گمراہ، خام خیال، ہرزہ سرا کہتے رہے، جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ لوگ اپنے اظہار خیال میں آزاد و بے باک تھے، جذبات سے مغلوب ہو کر جو چاہتے کہہ جاتے۔ شرع و آئین کا لحاظ نہ کرتے علماء اس رویہ کو خلافِ مذہب و اخلاق سمجھتے، ایک طرف تو یہ کشمکش تھی دوسری طرف تصوف نے آزاد خیالی کو اور تقویت دے دی، شاعروں کو اپنی وسیع النظری و بے باکی کے لئے ایک مذہب کی سرپرستی بھی مل گئی، وہ اپنے انوکھے خیالات کا مواد صوفیائے کرام کے اذکار و اشغال میں تلاش کر لیتے۔ تصوف کئی لحاظ سے شریعت سے ذرا الگ اپنی دنیا آباد کرنا چاہتا تھا، وہ رسوم و قیود کی پابندی اپنے حلقہ بگوشوں کے لئے ضروری نہ سمجھتا تھا، نماز روزہ کی پابندی پر سختی سے زور نہ دیتا، بلکہ ان میں سے بعض صوفیائے کرام کا کہنا تھا کہ

نمازِ عاشقاں ترکِ سجود است

تصوف کے نزدیک دیر و کعبہ، زنار و سبحہ میں کوئی فرق نہ تھا اور یہ نظریہ اہل شریعت کو بیحد

ناگوار تھا۔ کم و بیش فارسی شاعری کا بھی آزاد خیالی و بے باکی میں وہی حال تھا جو عربی کا، وہاں بھی زاہد، ناصح، واعظ کا مذاق اعلانیہ اڑایا جاتا تھا۔ عشقیہ شاعری کی محفل میں مذہب بے رنگ اور رسوم و قیود بے معنی تھے، شعرا اپنی جرأت رندانہ پر فخر و مباہات کرتے تھے اور جو لوگ ذہنی طور پر ان سے قریب تھے خواہ وہ شاعر یا ادیب نہ رہے ہوں مگر اس رویہ کو مستحسن سمجھ کر داد دیتے اور لطف لیتے رہے بظاہر یہ سلسلۂ خیال و جذبات نگاری ایک ایسی ادبی روایت بن گئی جو بزم ادب کو گرمانے کے لئے اچھا خاصا سامانِ نشاط فراہم کرتی، ان ہی ساز و سامان سے اردو شاعری نے بھی اپنی محفل سجائی۔ اردو ادب ذہنی طور پر فارسی سے بہت قریب تھا، ہیئت و مواد اس نے سب کچھ فارسی ہی سے لیا۔ جذبات و محسوسات میں نمایاں یگانگت رہی، شعرا کا انداز فکر بھی کم و بیش یکساں رہا۔ اردو کے ادیب و شاعر ابتدا میں فارسی کے اچھے عالم ہوتے، اردو کا ہر مشہور شاعر فارسی میں بھی شعر کہتا، ایسی صورت میں ناممکن تھا کہ اردو شعرا فارسی والوں کی تقلید نہ کرتے، ان کی شاعری سے فائدے نہ اٹھاتے، ان کے خیالات و جذبات سے متاثر نہ ہوتے، منجملہ اور عناصر کے تصوف بھی اپنی شاعری میں وہ لائے۔ چونکہ وہ ذہنی طور پر خود بھی تصوف سے متاثر تھے اس لئے اس موضوع پر خاص توجہ ہوئی۔

تصوف کی انفرادیت کی بنیاد محبت پر تھی اور غزل اپنی نشو و نما و توانائی و رعنائی کے لئے محبت ہی کو سرمایۂ حیات سمجھتی تھی اس لئے بھی تصوف سے دلچسپی لینا ناگزیر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ادب کے لئے تصوف جزو لاینفک ہو گیا۔ ان لوگوں کا ذکر ہی کیا جو واقعی صوفی تھے وہ برابر اپنے اشعار میں اس موضوع پر طبع آزمائی کرتے رہے لیکن جو شعرا درحقیقت صوفی نہ تھے وہ بھی اپنے کلام میں جابجا ایسے جذبات و خیالات لاتے جو تصوف ہی کے پروردہ ہوتے۔ غرض کہ اس عقیدے سے وابستگی حقیقت کے علاوہ روایت بھی ہو گئی تھی۔ ہر شاعر اس موضوع پر کچھ نہ کچھ کہتا خواہ تصوف سے اسے ذہنی لگاؤ ہو یا نہ ہو۔

تصوف روز بروز اپنا حلقہ اثر وسیع تر کرتا رہا اس کی گیرائی پہلے ہی سے اہل ظاہر کو کھل رہی تھی جب اس میں ہمہ گیری آئی تو فقہا اور اہل ظاہر اتنا برافروختہ ہوئے کہ ان کو اسلام خطرے میں نظر آنے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرح کی مخالفتیں طرفین سے شروع ہو گئیں۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں

اس کشمکش پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "فقہا اور اہل ظاہر ہمیشہ دو فرقوں کے سخت مخالف رہے۔ ایک اہل باطن کے دوسرے اہلِ رائے کے۔ فقہا کے فتوؤں سے ان دونوں گروہوں کو ہمیشہ سخت نقصان پہنچتے رہے ہیں، قتل کئے گئے ہیں، دار پر چڑھائے گئے ہیں، مشکیں بندھی ہیں، کوڑے کھائے ہیں۔ قیدیں بھگتی ہیں۔ جلاوطن کئے گئے ہیں۔ کتابیں جلائی گئی ہیں اور کیا کیا کچھ ہوا ہے۔ جب کہ فقہا کی مخالفت کا ان لوگوں کے ساتھ یہ حال تھا تو وہ بھی تصنیفات میں نثر ہو یا نظم خوب دل کے بخارات نکالتے بقول شخصے "کسی کا ہاتھ چلے کسی کی زبان"، فقہا اور واعظین ان کے اقوال و افعال پر گرفت کرتے تھے۔ انھوں نے ان کی قلعی کھولنی شروع کی، وہ کہتے تھے یہ لوگ خلافِ شرع کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا شراب خواری و قمار بازی جو اکبر الکبائر ہیں وہ بھی جو فروشی و گندم نمائی سے بہتر ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلافِ شرع باتیں کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا اعلانیہ کفر بکنا اس سے بہتر ہے کہ دل میں کفر ہو اور زبان پر اسلام وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اوروں کو ہدایت کرنے اور آپ گمراہ رہنے سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں، وہ کہتے تھے کہ تم لوگ حقوق الٰہی ادا نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ تم حقوق عباد میں خیانت کرتے ہو، الغرض شعرائے متصوفین نے جو اہل ظاہر پر خوردہ گیریاں کی ہیں وہ اسی قسم کی تعریضات اور مطائبات ہیں"

یہاں تک پہنچ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مذہب کی شاہراہ پر نہ چلنے والے کچھ تو اس وجہ سے اپنی پرانی طرزِ عبادت نہ چھوڑنا چاہتے تھے کہ ان کے آباؤ اجداد سے ان کے رسم عبودیت چلی آرہی ہے اور کچھ اس سبب سے بھی کہ ان کی سرکشی یا ان کے لحاظ سے ان کی خودداری اس کی اجازت نہ دیتی تھی کہ کسی غیر کی اہمیت اتنی زیادہ مان لیں کہ اس کے فرمان پر چلنے لگیں اس کی بارگاہ میں سر جھکائیں ان کا فطری جذبہ، اختلاف و پیکار پر بھی آمادہ کر دیتا تھا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تصوف نے حقیقت شناسی کے بہت سے نئے دریچے کھول دیئے۔ صوفیائے کرام کی دور بین نگاہوں نے ظاہری رسوم و قیود سے نکل کر اصل حقیقت کو بغیر کسی خارجی سہارے کے دیکھنا چاہا اس پر اگر اہل ظاہر معترض ہوئے تو وہ برافروختہ ہو گئے کہ ہم لوگوں پر جن گناہوں کا اتہام ہے وہ دراصل گناہ ہی نہیں لیکن اگر ہوں بھی تو اہل ظاہر کے گناہوں کے سامنے بے حقیقت ہیں اس لئے کہ ان کو معرفت حاصل نہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ خدا کیا ہے اس تک پہنچنا

کیسے ممکن ہے۔ ہم اس کی تلاش میں سرگشتہ و حیران ہیں۔ اس سرگشتگی و حیرانی میں اگر کچھ گناہ سرزد ہو جاتے ہیں تو اسکی قدر و قیمت اس سے پوچھیے جو گناہوں کا حساب لینے والا ہے۔ ظاہر بین آنکھیں اس کی اہمیت نہیں دیکھ سکتیں گویا وہ میر درد کے الفاظ میں کہتے تھے کہ ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

یہ قیاسات اس نتیجے پر پہنچا دیتے ہیں کہ بعض انسان رائے عامہ سے کیوں انحراف کرتے تھے وہ مذہبی رسوم و قیود سے بے نیازی کیوں برتتے تھے لیکن اس سوال کا جواب نہیں ملتا کہ گناہ پر بجائے اظہار ندامت کے وہ فخر و مباہات کیوں کرتے تھے۔ یہ کیوں کہتے تھے کہ ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

یا اس طرح کیوں سوچتے تھے کہ ؎

بندہ نوازیوں پہ خدائے کریم تھا
کرتا نہ میں گنہ تو گناہِ عظیم تھا

اس راز کو پانے کے لیے ہم کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس طرح سوچنے اور کہنے والے اور خاص کر تصوف سے وابستہ رہنے والے شعراء کا ذاتی خیال ایمان، گناہ اور عبادت کے بارے میں کیا تھا۔ وہ اپنی شاعری کی دنیا میں پہنچ کر اخلاق کی اعلیٰ قدروں کا معیار کیا رکھتے تھے۔ یوں تو یہ شعرا کسی خاص مذہب کے پابند تھے اور سماج میں رہ کر عبادت کے وہ رسوم بھی ادا کرتے تھے جو ان کے فرقے کے دوسرے اشخاص بجا لاتے تھے مگر جب وہ عوام و خواص سے الگ ہو کر شاعری کی فضا میں سانس لیتے تو کم از کم اتنی دیر کے لئے اپنے کو ایک دوسری شخصیت کا مالک سمجھتے ایک خاص جذب و کیف سے متاثر ہوتے تھے یہاں وہ یہ محسوس کرتے کہ عشق سے بڑھ کر کوئی شے نہیں حصول عشق مقصد حیات ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے وفاداری کی سخت ضرورت ہے اس کی اہمیت ان کے نزدیک اتنی تھی کہ کبھی کبھی ان کو ایمان کا مترادف سمجھا۔ چنانچہ مرزا غالب نے باعلان کہہ دیا کہ ؎

وفاداری بشرطِ استواری عین ایمان ہے

یہ احساس ان کے ضمیر و روح کو گرما دیتا ان کی نظروں کو وہ روشنی عطا کرتا جو عام طور سے اہل ظاہر کو نصیب نہیں ہوتی۔ ان کو ہر طرف عشق ہی عشق نظر آتا، کسی خاص مقام یا علامت کی قید نہ رہتی کعبہ و بت خانہ ہر جگہ وہی نور نظر آتا۔ یہ حقیقت کوئی مفروضہ نہیں اس کا ثبوت متعدد شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ مثلاً سودا کہتے ہیں ؎

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ
جو شمع حرم رنگ جھلکتا ہے بتاں کا

وہ بت خانہ کو بھی نورِ خدا کے لئے حجاب نہیں تصور کرتے تھے کسی شئے کو بھی اس کا پردہ نہیں مانتے تھے بلکہ ہر اس شے کو جو عرف عام میں پردہ سمجھی جاتی تھی اس کو بھی مرکز نور تک پہنچنے کا وسیلہ خیال کرتے تھے۔ چنانچہ غالب نے کہہ بھی دیا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

جب وہ اس طور سے اپنے کو راہِ عشق میں کامیاب ہوتے دیکھتے تو ان کو پھر ان کی ضرورت نہ رہ جاتی تھی کہ کسی مذہب کے رسوم و قیود یا مقررہ عبادت کی پابندی کر کے خوشنودی حاصل کریں وہ اپنے طور پر حسن یا نور سے دلچسپی لیتے اس کے تصور میں منہمک ہوتے اور اس جستجو یا انہماک کو عبادت سمجھتے خواہ وہ کسی حالت میں کسی طرح ادا ہو جائے ان کے نزدیک گناہ صرف ایک تھا۔ کسی وقت حسن سے متاثر نہ ہونا اس کے حصول میں کوتاہی کرنا یہ سب محسوسات تھوڑی دیر کے لئے سہی، مگر متاثر ہونے والے کی روح میں اتنی بالیدگی پیدا کر دیتے تھے کہ وہ اپنی شخصیت کو ہر اس شخص سے بلند سمجھنے پر مائل ہوتے جو صرف رسوم و قیود میں الجھ کر رہ گیا ہے جو یہ نہیں سمجھ سکا کہ روح کی غذا حسن و عشق ہے نہ کہ سبحہ و زنار کی دلچسپی یا دیر و حرم کی پاسبانی۔ ان محسوسات و نظریات کے حامل کو اہل ظاہر کے اعتراضات و الزامات کا وہ اثر نہیں ہو سکتا جو عام طور سے لوگوں پر ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنی دھن میں منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اپنے انداز سے راہِ محبت میں قدم اٹھاتا رہا ہے۔ زاہد و

محتسب، ناصح و واعظ کی نکتہ چینیوں کو وہ سنگِ راہ سمجھ کر ٹھکراتا چلا جاتا ہے۔ اس انہماک میں اگر وہ غلطی کا مرتکب بتایا جاتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے یہ غلطیاں لذت کے لئے نہیں کیں بلکہ حصولِ مقصد کے لئے یہ باتیں ضروری تھیں۔ ان سے اسے توانائی وسیع النظری اور دنیا سے بے فکری ملی۔ وہ اس طرح سوچتا ہے تب ہی تو کہتا ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہئے

وہ اپنے مقصد کے پرتو میں دیکھتا ہے کہ یہ ظاہری حالت جیسی بھی ہو زاہد و واعظ کی نظروں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ وہ اس قدر نہیں سمجھتا وہ صرف فتویٰ دینا چاہتا ہے دل کا راز اور رازکی نہوں سے ناواقف ہے۔ اس حالت یا لغزش کی قیمت صرف اہل نظر کو معلوم ہے اس کی قیمت خدا جانتا ہے اس لئے کہ وہ ایک بڑے مقصد کے حصول کے سلسلہ میں ہوئی ہے اور وہ مقصد جس طرح بھی حاصل ہو سکے بجائے خود اتنا وقیع ہے کہ جس کو عرفِ عام میں گناہ سے تعبیر کیا جا رہا ہے وہ بھی ناقابلِ قدر ہو جاتا ہے۔ یہ احساس شاعر کو زاہد پر ہنسنے اور اپنے پر فخر محسوس کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ بجا طور پر سوچتا ہے کہ سالک راہِ محبت، زاہد کے موسوم کردہ گناہوں کے باوجود نفسیاتی خواہشات اور دنیاوی لذات میں الجھ کر نہیں رہ گیا وہ منزلِ مقصود تک پہنچا یا نہیں پہنچا مگر جہاں تک راہِ محبت میں گذرا خلوص و استقلال کے ساتھ آئینِ محبت پر گامزن رہا اگر راہ میں کہیں لغزش بھی ہوئی تو اسے لغزشِ مستانہ سمجھنا چاہیئے نہ کہ زُہدِ ریائی یا نفس پروری کا نمونہ۔

عظمت گناہ کے احساس کا راز اس تصور میں مضمر ہے جس نے شاعر سے یہ کہلایا کہ 'شاعری جزویست از پیغمبری'، شاعر اپنے خیالات اور اپنی تخلیق کا رشتہ الہامی مدرکات سے منسلک سمجھتا ہے اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی فکر ایک خاص روحانی ربط کا نتیجہ ہے اور بقول آتش ؎

کیفیت اسے ملتی ہے ہو جس کے مقدر میں
مے الفت خم میں ہے نہ شیشہ میں نہ ساغر میں

اس احساس کے بعد اس نے فن و فکر کو مقدس و محترم سمجھا تو تعجب کیا ہے اگر یہ خیال ہوا کہ

وہ اس دنیا میں ایک ایسی ہستی ہے جو عوام و خواص سے برتر ہے جس کے خیالات و اشعار کسی پیغمبر کے ارشاد کے برابر نہ سہی لیکن اس کے قریب ہیں، اس کی شاعری پیغمبری تو نہیں مگر جزو پیغمبری ضرور ہے۔ اس احساس نے اس کو ایک ایسی بلندی پر پہنچا دیا جہاں سے یہ نظر آیا کہ سچے شاعر کا مذہب عام مذاہب سے جدا ہے۔ اس کی آزاد دنیا میں نزاکت، لطافت، حسن و جمال کی فرمانروائی ہے۔ رسم و رواج، سود و زیاں کے تصور کا کبھی یہاں گزر نہیں، مروجہ قانون و شریعت کی پابندیاں اور بظاہر اخلاقی قدریں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ بات بات پر ادنی لغزش پر کفر کا فتویٰ دینے والے حقیقتِ امر سے ناواقف ہیں۔ ملائے مکتبی ہمارے افعال و اعمال پر تبصرہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ شاعری کو ہذیان اور شعراء کو غلط گو سمجھنے والا بر خود غلط ہے۔ وہ اپنے محدود علم کی فرسودہ عینک سے دل کے دریچوں اور جلوہ گاہ حسن کو دیکھنے کی حد تک دیکھ نہیں سکتا، وہ اپنا دل و دماغ غور و حنت کے لئے وقف کر چکا اس کی اطاعت کبھی نمائش اور اس کا فرمان کبھی دفتر بے معنی ہے۔ جب تک ہم ایوان شاعری اور دنیائے فن میں قیام پذیر ہیں ہمارے خیالات پر، ہمارے فرمودات پر اس آزاد مذہب کی چھاپ رہے گی جو ہماری مخصوص نشانی ہے۔ عام دنیا نہ ہمارا مفہوم سمجھتی ہے نہ الفاظ کے پردے اٹھا کر نفس مضمون کا جلوہ دیکھ سکتی ہے۔ ایسی دنیا اگر ہمارے بعض خیالات و افعال کو گناہ سمجھتی ہے تو ہم کو اپنے اس گناہ پر فخر ہے۔ ہم اس سے لطف اٹھاتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہیں گے، ان کا احتساب ہمارے لئے سدِ راہ کیوں ہو۔ یہی احساس افتخار و برتری اس کو آدمیوں سے کیا بعض امور پر فرشتوں اور نبیوں سے بھی اپنے کو بلند تر سمجھنے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ گستاخی فرشتہ کبھی برداشت کرنا اپنی توہین سمجھتا ہے ان کی گفتگو کو باعثِ دردِ سر سمجھ کر کہتا ہے ؎

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا (سودا)

وہ اپنے نشہ عشق میں اتنا سرشار ہے کہ شیخ و زاہد کی انتہائی تمنا کا خواب یعنی خود کو کبھی نہیں منہ لگانا چاہتا۔ ایسے ہی جذبہ کی ترجمانی اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے ؎

حور سے کہتا ہے چھیڑا نہ کرو تم مجھ کو — کوئی دیکھے تو ترے عاشق شیدا کا مزاج

وہ اپنی جمالیاتی حس و سوز دل سے اتنا متاثر ہو جاتا ہے کہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ شاید اس کے ایسا راہِ محبت میں کوئی دوسرا نہ گزرا ہوگا۔ اس کے دل کی آگ جتنی بھڑک چکی ہے اور سوزِ عشق نے اس کو جو پختگی عطا کر دی ہے وہ حضرت موسیٰ کو نصیب نہیں اسی لئے وہ اس برگزیدہ نبی کو بھی اس پہلو سے اپنے مقابلہ میں کمزور پاکر کہتا ہے ؎

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
اک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا (میر)

اور ہمہ حسن سے مخاطب ہو کر نکتہ چینی کی راہ سے فرماتا ہے ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر (غالب)

اس کا یہ احساس برتری ہی اس سے کہلاتا ہے ؎

منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لئے شرمندہ احساں ہوں گے؟ (مومن)

غالب کی بے نیازی کا راز اسی احساس میں پنہاں ہے جو ان سے یہ شعر کہلاتا ہے ؎

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اس طرح شاعر حضرتِ خضر و الیاس ایسے انبیا کی اہمیت کے بعض پہلو اپنے طور پہ کمزور محسوس کرتا ہے، اپنی برتری کا اعلان کیا کرتا ہے۔ اگر اس انداز بیان و طرزِ تخیل کو کوئی شخص انبیا کی تحقیر سمجھ کر شاعر کو غلطی و گناہ کا رخیال کرتا ہے تو شاعر اس طرح کے سوچنے والے کی بات سن کر فخریہ انداز میں کہتا ہے ؎

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم با خلق ما را کار نیست

ہم نے اوپر کہیں عرض کیا کہ ایک انسان کی کئی شخصیتیں ہوتی ہیں اس کلیہ سے شاعر بھی

مستثنیٰ نہیں بلکہ عام انسان سے بیک وقت زیادہ شخصیتوں کا مالک ہوتا ہے چونکہ وہ زیادہ حساس، زیادہ ذہین اور زیادہ فکری صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے اس لئے گوناگوں جذبات و خیالات دل و دماغ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ وہ ہر چیز پر مختلف زاویہ سے نظر کرتا ہے، پروازِ تخیل کی بدولت کائنات کی سیر کرتا ہوا، ہر منظر و مطالعہ سے دلچسپی لیتا، دنیا کے بڑے بڑے لوگوں فنون و علوم سے اپنے تصور میں دوچار ہوا کرتا ہے اس کا شوق بے پایاں چاہتا ہے کہ شاعر دنیا کا سب سے عظیم و معروف فرد ہو جائے وہ علم و فضل کے لحاظ سے ہمہ دان ہو اور فنون کے اعتبار سے ہر فن کا ماہر بھی ہو۔ شاعر اپنی اس خیالی دنیا میں ان سب مخصوص ہستیوں، علوم و فنون کو لاتا ہے جو اس کے نزدیک قابلِ قدر ہیں جو اس کے ذہن میں ایک خاص عظمت کی مالک ہیں اور پھر سوچتا ہے کہ کاش میں بھی ایسا ہی عظیم شخص ہوتا اپنے جذبہ اشتیاق کو تھوڑی دیر کیلئے حقیقت سمجھ کر وہ اپنے کو غیر معمولی انسان تصور کرنے لگتا ہے۔ ہمارے اس بیان کی وضاحت استاد ذوقؔ نے ایک قصیدہ میں بڑی اچھی کر دی ہے ملاحظہ ہو۔

شب کو میں اپنے سرِ بستر خواب راحت — نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت
مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے — تھا تصور مرا ہر امر میں تصدیق صفت
ہو گیا علم حصولی، تھا حضوری مجھ کو — تھا مرا ذہن نہ محتاج حصولِ صورت
نہ غرض مجھ کو نتیجہ سے، نہ تھا شکل سے کام — تھی مری فکر کو ہر شکلِ خطا سے عصمت

کبھی تھا عقل پہ مذہب مرا مانندِ حکیم — کبھی مثلِ متکلم مجھے پاسِ ملت
کبھی کرتا تھا قدم چرخ کا ثابت بجہات — اور کبھی کرتا تھا باطل بسمار المشقت
کبھی انکار قیامت پہ میں لاتا تھا دلیل — کبھی تکرار تناسخ پہ مجھے سوجھتی حجت

کبھی میں کرتا تھا اعراض میں جوہر قائم — کبھی میں کرتا تھا معلوم سے ثابت علت

کبھی میں نفیِ حقائق میں تھا سوفسطائی | کبھی میں معتزلی باعثِ ردِّ رذیت
کبھی میں جبری و مجبور بہ عقل و تدبیر | کبھی میں قدری و مختار بہ قدرِ طاقت

کبھی پیشِ نظر انجیل و زبور و توریت | کبھی مصحف میں نظر میری سرِ ہر آیت
کبھی زرتشتیوں میں ایسا کہ سارے معبد | ژند و پاژند میں کرتے تھے میری تبعت
کبھی یہ آگہی شاستر و بید و پران | کروں میں ایک باسے پنڈت کی کتھا میں کھنڈت

شاعر کی اس خیال آرائی کو چاہے تو سمجھیں یا انانیت سے تعبیر کریں یا مجذوب کی بڑ خیال کریں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا اس طرح سوچنا اور اپنے کو سب کچھ سمجھنا، غیر فطری نہ تھا ہر انسان حسب استعداد اس طرح کے خیالات ذہن میں لاتا ہے تاکہ اس کا ماحول بدل جائے اور واقعات کی ٹھوس حقیقت اور حادثات کی شدید تلخی جن سے آئے دن اس کا مقابلہ رہتا ہے وہ اس کی زندگی اجیرن نہ کر دیں، ان تصورات کی دلفریبی تھوڑی دیر کے لئے انسان میں امنگ پیدا کر کے اس کو مصائب و خشک واقعات سے مقابلہ کرنے کی طاقت عطا کرتی ہے۔ شاعر جب تک تخیل کی دنیا میں رہتا ہے جذبات کا سہارا لے کر ذہن کو ہر اس نقطۂ عروج پر لے جاتا ہے جہاں بڑے سے بڑا آدمی کبھی نہ پہنچ سکا ہو خواہ وہ آدمی کافر رہا ہو یا مومن تھوڑی دیر کے لئے اس نے شاعرانہ فضا میں اپنی دنیا آپ پیدا کرلی ہے۔

اس نظریہ کے لحاظ سے یہ کبھی ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر صرف تصوف و عشق ہی کی دنیا میں اپنے کو برتر نہیں سمجھتا بلکہ ایک وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ہر معرکہ میں اپنے کو نامورروں سے بلند تر سمجھنے لگتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ

اک طفل دبستاں ہے فلاطوں میرے آگے
کیا بس ہے ارسطو جو کرے چوں میرے آگے

اسی قسم کا جذبہ رہا ہوگا جس نے فیضی سے کہلایا کہ ؎

امروز نہ شاعرم، حکیمیم | دانندۂ حادث و قدیمیم

ان تمام باتوں اور حقیقی شاعر کے نفسیات کا جائزہ لینے کے بعد اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس جذبۂ افتخار و احساس برتری سے ادب زندگی کو کیا فائدہ ہوا تو فی الحال ہم مفصل جواب دینا مناسب نہیں سمجھتے۔ اول تو یہ بحث بھی کافی طوالت کا باعث ہوگی اور دوسرے موجودہ موضوع سے اس کا کوئی تعلق بھی نہیں معلوم ہوتا لیکن مختصر طور سے یہ عرض کر دینا شاید بے جا نہ ہوگا کہ شاعر کے اس رویہ سے انسان کی وہ اہمیت سامنے آجاتی ہے جو اور طریقہ سے ممکن نہ تھی اپنے اور اپنے اعمال پر غیر معمولی اعتماد کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ راہِ حق میں کسی بھی بڑی سے بڑی ہستی سے بھی مرعوب ہونا غلط ہے دوسرا فائدہ یہ نظر آتا ہے کہ اس اندازِ فکر سے وہ سختیاں کم ہوگئیں جو مذہب کے اجارہ دار اپنے طور پر دنیا والوں پر عائد کرنا چاہتے تھے یہ بھی محسوس ہوا کہ دنیا میں آزادیٔ خیال کی جگہ ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی دکھائی دیئے جو اپنے دل اور دماغ سے کام لیتے ہیں۔ کورانہ تقلید کو گناہ سمجھتے ہیں وہ نہ واعظ کے فتووں سے ڈرتے ہیں نہ دار و رسن کی آزمائش سے۔ آج ہماری جیتی جاگتی دنیا کو اس اختلاط و ارتباط کی ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ مذاہب ایک دوسرے کے قریب آجائیں چنانچہ بین الاقوامی سطح پر اس کی کوشش ہو رہی ہے کہ ان پہلوؤں کو تلاش کیا جائے جو ایک مذہب سے دوسرے کو قریب کر دیں تاکہ یک جہتی زیادہ ہو سکے اپنے شعراء کے زیر بحث کارنامے کو دیکھ کر ہم یہ سوچتے ہیں کہ جس بات کی دنیا کو اب جستجو ہے وہ ہمارے شاعر بہت پہلے پیش کر چکے ہیں۔

آخر میں عرض کرنا ہے کہ یہ جذبۂ افتخار و احساس برتری کی حقیقت ایک روایت بن گئی ہے جس کو بغیر سوچے سمجھے عام شعراء نے تفریحِ طبع کے لئے اختیار کر لیا۔ یہ احساس صرف سچے اور بڑے شاعروں کے دل و دماغ پر اثر انداز تھا ورنہ عام شعراء کا اس راز کو پانا انکی دسترس سے باہر تھا وہ صرف اسلئے اس طرح لکھتے رہے کہ بزرگوں سے یہ بات چلی آئی ہے اور کچھ غیر شاعروں نے بھی ان خیالات کو سراہا اس قسم کے اشعار ان شاعروں کے یہاں زیادہ تر زیبِ داستاں کے طور پر آتے رہے ہیں جیسے مے خواری کا ذکر ہر شاعر کرتا آیا ہے خواہ اس نے کبھی شراب چکھی بھی نہ ہو، شد و مد سے اظہار عشق کرتا رہا ہے حالانکہ اس کے دل کو ٹٹولا جائے تو کسی گوشہ میں دردِ محبت کا پتہ نہ چلے گا۔ بالکل اسی طرح کافی تعداد اپنے شعراء کی ملے گی جو بغیر مطالعہ و علم کے ان موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہے ورنہ اس سے انکار نہیں کہ یہ محسوسات بڑے علم، خاص حقیقت اور انکشاف پر مبنی ہے۔

....

سید احتشام حسین

ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین

اکبر کو اپنے عہد کے الہ آباد میں اپنے اور امرودوں کے سوا بہبود کے دوسرے سامان بالکل نظر نہ آئے۔ مجھے معلوم نہیں اکبر سے پہلے الہ آباد میں کسے ایسی شہرت اور اہمیت حاصل تھی جسے وہاں کے امرودوں کے ساتھ یاد کیا جاتا رہا ہو اور یہ بات بھی تحقیق طلب ہے کہ الہ آباد کے امرودوں کو کسی زمانے میں وہ انفرادیت نصیب ہوئی جب ان کا ذکر دوسری جگہ کے امرودوں سے الگ کیا جانے لگا لیکن اپنے عہد کے الہ آباد کے متعلق یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں کے جن لوگوں کو جانے بغیر الہ آباد کی معرفت ادھوری رہ جائے گی ان میں ایک ذات پروفیسر سید اعجاز حسین ایم۔ اے ڈی لٹ، صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی بھی ہے۔ امرود اب بھی اپنی جگہ پر ہیں لیکن انسان ایک دوسرے کے لئے جگہ خالی کرتے رہے ہیں۔ اعجاز صاحب (اس سارے مضمون میں انھیں اسی نام سے یاد کیا جائے گا) شدومد کے ساتھ اپنی اہمیت کے قائل نہ ہوں لیکن وہاں کے امرودوں کی برائی نہیں سن سکتے، مجھے یاد آتا ہے کہ پہلے اکبر کی برائی سن لیتے تھے، اب الہ آبادیت کے غلبہ کی وجہ سے یہ بھی گوارا نہیں۔ خیر، تذکرہ ہے اعجاز صاحب کا، اور ان کی انفرادیت کے پیش نظر میں انہیں اکبر یا امرود کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرنا چاہتا اگرچہ ان کا تعلق دونوں سے ہے۔ اکبر پر انھوں نے ہندی میں ایک کتاب لکھی ہے اور امرودوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں، اکبر کو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ امرود کھاتے اور کھلاتے ہیں۔

اعجاز صاحب کو میں نے پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۳۲ء میں دیکھا اور پہلی ہی ملاقات میں مجھے ان کی ان خصوصیات کا اندازہ ہو گیا جنھیں میں اب بھی ان کی ذات اور شخصیت کا جزو سمجھتا ہوں، یہ خصوصیات شعر و ادب سے متعلق نہیں، انسان کی روزمرہ کی اخلاقی، سماجی اور عملی زندگی سے وابستہ ہیں۔ یہاں اپنے متعلق کچھ

کہناناگزیر ہوگا اور اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

اعظم گڈھ سے ۱۹۲۶ء میں ہائی اسکول کرنے کے بعد میں نے مزید تعلیم کے لئے الہ آباد کا رخ کیا۔ وہاں کچھ آسانیاں تھیں اور میری قدرے محدود زندگی کے لئے اس اہم عمل اور سیاسی مرکز میں ایک کشش، چنانچہ وہاں دو برس گورنمنٹ انٹر کالج میں پڑھتا رہا۔ اس دو سال میں اعجاز صاحب کا نام تو میں نے کبھی کبھی سنا لیکن ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ چوک میں کتابوں کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی۔ آتے جاتے میں اس پر کبھی ٹھہر جاتا تھا۔ کتابیں خرید تو مشکل سے سکتا تھا لیکن نگاہوں کی دعوت ہو جاتی تھی۔ ایک دن ایک نئی کتاب نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ دیکھا تو ایک تازہ تصنیف تھی "آئینۂ معرفت"، مصنف کا نام سید اعجاز حسین۔ دوکان پر جو بوڑھے میاں بیٹھے تھے انھوں نے مجھے بہت زیادہ پرشوق دیکھ کر چند جملے کتاب کی تعریف میں کہے اور مصنف کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیا۔ میں نے ان کی آنکھیں بچا کر اپنی جیب ٹٹولی تو کتاب کے آدھے دام بھی نہ تھے، چلا آیا اور اس کتاب کے پڑھنے کے لئے بہتر وقت کا انتظار کرنے لگا۔

انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ کا سوال تھا۔ وہ سہارا ختم ہو چکا تھا، جس کے بھروسہ پر الہ آباد میں تھا۔ کوئی نوکری تلاش کروں یا پڑھوں۔ اسی کشمکش میں تھا کہ میرے دو بھائی اور دوست سید محمد شفیع مرحوم اور سبط حسن آگئے اور انھوں نے اصرار کیا کہ بی۔ اے میں نام لکھا لو، کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ یہ وہی سبط حسن ہیں جو پاکستان کی جیلوں میں کئی سال کی قید و بند جھیل کے اب لاہور میں ایک صحافی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ شفیع بھائی مرحوم نے اسی سال بی اے پاس کیا تھا، سبط حسن بی اے میں پڑھ رہے تھے۔ جب یہ لوگ الہ آباد جانے لگے میں بھی ساتھ ہو لیا۔ یونیورسٹی پہنچ کر نام لکھا لیا۔ بورڈنگ ہاؤس کے اخراجات میرے امکان میں نہ تھے۔ چاہتا تھا کہ دوسرے طلباء کے ساتھ کہیں قیام کروں اور تعلیم کا سلسلہ جاری رکھوں۔ شام کے وقت شفیع بھائی مرحوم مجھے ساتھ لے کر نکلے اور اپنے بعض جاننے والوں سے ملے کہ میرے قیام کی کوئی صورت نکل سکے۔ جب کئی دوستوں سے مل ملا کر واپس آنے لگے تو شفیع بھائی مرحوم نے کہا کہ چلو تمھیں اعجاز صاحب سے بھی ملا دیں، بہت اچھے آدمی ہیں۔ اعجاز صاحب اُن دِنوں محلہ راجہ پور میں گنگا کے کنارے اپنے

ننہالی مکان میں رہتے تھے۔ اندر مکان بہت بڑا تھا لیکن باہر ایک کمرہ تھا جس میں کچھ زیادہ سامان نہ تھا۔ ایک میز اور چند کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ لکھنے پڑھنے کا سامان تھا نہ کتابیں۔ سامنے صحن تھا جہاں سے دریائے گنگا اور اس کے گرد وپیش کا برساتی منظر دکھائی دے جاتا تھا۔ اطلاع کراتے ہی اعجاز صاحب باہر تشریف لائے، اخلاق اور گرمجوشی سے ملے، ایسا اخلاق جو تصنع سے سراسر معرّا ہوتا ہے، صاف شفاف شیشے کی طرح جس کے پار دیکھا جا سکتا ہے۔ کمرے کے بجائے ہم لوگ صحن میں بیٹھے مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ اس دن کیا کیا باتیں ہوئیں لیکن یہ یاد ہے کہ جب میرے قیام کے لئے کسی جگہ کی تلاش کا سوال آیا تو کہا کہ جب تک کہیں انتظام نہیں ہو جاتا یہیں رہیں، یہ کمرہ خالی ہی تو رہتا ہے۔ کچھ تکلفات اور عذر و معذرت کے بعد یہی بات طے ہوگئی۔ اعجاز صاحب کا اصرار دوسرے خیالات اور تاملات پر غالب آیا۔ میں چند دنوں میں وہیں اٹھ آیا اور چند دن قیام کرنے کا ارادہ کم وبیش چھ سال کے قیام میں تبدیل ہوگیا۔

انھی دنوں ایک اور لطیفہ پیش آیا۔ گرمیوں کی تعطیل کے زمانے میں جب وطن میں قیام تھا اور سبھی عزیز اور دوست اکٹھا تھے کسی سلسلہ میں یہ طے پاگیا کہ چند مہینے تک بال نہ ترشوائے جائیں۔ بالوں پر تقریباً دو مہینے گزر چکے تھے جب میں اعجاز صاحب کے یہاں آیا۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو چھپی رہتی۔ چند دن تو اعجاز صاحب نے میرے بالوں کی بے ترتیب باڑھ کو غور سے دیکھا اور سوچا کہ شاید کوئی زبردست انقلابی اور آشفتہ سر اشتراکی ہے لیکن جب ان باتوں کی کوئی خاص علامت مجھ میں نظر نہ آئی تو انھوں نے بڑی نرمی اور آہستگی سے کہا، احتشام صاحب! آپ بال کیوں نہیں کٹواتے؟ میں جانتا تھا کہ کسی نہ کسی دن یہ سوال ضرور اٹھے گا، میں نے کہا فرصت نہیں ملی، اگلے اتوار تک بنوالوں گا۔ اور اگلا اتوار بھی گزر گیا۔ اب کچھ ایسا تھا کہ اعجاز صاحب سے دیر دیر تک باتیں ہوتی تھیں۔ گھر، خاندان، تعلیم، ادبی دلچسپی اور تفریحی مشاغل کا ذکر آتا تھا۔ آخر انھوں نے ایک دن کسی قدر سختی سے کہا، آخر بات کیا ہے کہ آپ بال نہیں ترشواتے، کیا پیسے نہیں ہیں؟ میں نے سوچا کہ اب اتنی دور بیٹھ کر کسی شرط کی پابندی اس طرح کرنا کہ دیکھنے والوں کو ناگوار گزرے، حماقت ہے۔ میں نے کہا، کل ضرور بنوالوں گا۔ اتفاقاً دوسرے دن دوستوں کے دستخط سے خط آگیا کہ بال کٹوا ڈالو کیونکہ ایک صاحب کو

"ٹائیفائڈ" ہوگیا اور ڈاکٹر نے "رسمِ موتراشی" ادا کرا دی، اب کسی پر پابندی نہیں۔ میں نے اعجاز صاحب کو وہ خط دکھایا اور بال ترشوانے چلا گیا۔ انھوں نے اس عجیب و غریب عہد و پیمان سے جو لطف لیا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔

یہ لطیفہ یوں لکھنا پڑا کہ چند ہی دن میں مجھے اعجاز صاحب کے مزاج، اندازِ فہمائش اور اندازِ گفتگو کا اچھا خاصا اندازہ ہو گیا۔ وہ نہ تو کسی ذاتی معاملہ میں ضرورت سے زیادہ اس کے پیچھے پڑتے ہیں، نہ اس طرح اپنی بات کہتے ہیں کہ ناگوار ہو، نہ یہ ظاہر ہونے دیتے ہیں۔ "چلو جی مجھے کیا مطلب"۔ مزاج کی یہی وہ خصوصیت ہے، جو انکے دوستوں اور شاگردوں کو ان کا گرویدہ بناتی ہے۔ اعجاز صاحب اپنی محبت شفقت اور ذاتی توجہ سے ہر شخص کی نجی زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں اور بہت جلد تکلف تصنع اور دوری کی وہ حدیں ٹوٹ جاتی ہیں جو ابتدائی ملاقات میں دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ان کے تمام دوستوں اور شاگردوں نے اس سحرکاری کا تماشا دیکھا ہے۔

بی اے میں میں نے جو مضامین لئے ان میں اردو ادب بھی تھا۔ مجھے اردو سے دلچسپی تھی، کچھ الٹا سیدھا لکھتا بھی تھا، شعر بھی کہہ لیتا تھا، جو کتاب ہاتھ لگتی پڑھ بھی لیتا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میری زندگی میں اردو کی کیا جگہ ہے لیکن یونیورسٹی کے باہر میں نے اعجاز صاحب کو اردو زبان و ادب ہی کے عشق میں سرشار پایا اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھنا اور بات ہے اور اس کے عشق میں مبتلا ہو جانا اور بات ہے۔ اعجاز صاحب نے کبھی واضح الفاظ میں مجھے اس کی تلقین نہیں کی، مجھے خاص طور سے اردو لکھنے پڑھنے کی طرف متوجہ نہیں کیا لیکن وہ جس طرح اپنی زبان سے دلچسپی لیتے تھے، اٹھتے بیٹھتے اس کا ذکر کرتے تھے، شعر سے لذت لیتے تھے، ان میں ایک چھوت کی سی کیفیت تھی۔ ان سے ہو کر اردو دوستی کی برقی لہریں دوسروں تک پہنچتی تھیں اور اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتی تھیں چنانچہ مجھے زبان و ادب کے متعلق کچھ نئے تجربے ہونے لگے۔

ان دنوں اعجاز صاحب مختصر تاریخ ادب اردو لکھ رہے تھے۔ یہ کتاب اس طرح لکھی جا رہی تھی کہ کچھ صفحے لکھ کر کاتب کو دے دیئے جاتے تھے۔ کتابت کی تصحیح ہو کر کاپیاں پریس کو بھیج دی جاتی تھیں۔ پروف پڑھے جاتے تھے اور کتاب چھپتی جاتی تھی۔ میں اکثر دیکھتا تھا کہ اعجاز صاحب کے

بعض ایم اے کے طلباء ان کے پاس آجاتے ہیں، کتاب کے بعض مباحث پر بحث ہوتی ہے، کچھ حصے پڑھے جاتے ہیں، "قلم زد" ہوتے ہیں، ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی ہیں لیکن کام نہیں رکتا۔ ان شاگردوں میں ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی، وقار عظیم، طالب الہ آبادی، جمیل قدوائی ہوتے اور یہی دخل در معقولات کا مرتکب ہوئے بغیر ان دلچسپیوں میں شریک ہوتا۔ دو چار ہفتے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ کاپیاں اور پروف میرے ذمے ہو گئے۔ چھوٹے موٹے مشوروں میں بھی شریک کیا جانے لگا اور کبھی کبھی لائبریری سے بعض کتابوں کے حوالے تلاش کرنے کا کام بھی میرے سپرد کر دیا گیا۔ مجھ سے کم تر ادبی ذوق رکھنے والا اور مطالعہ کرنے والا بھی ہوتا تو ان باتوں سے فائدہ اٹھاتا۔ میں نے جو کچھ بن پڑا سیکھا۔ اعجاز صاحب کا یہ عمل آج تک جاری ہے۔ وہ کتاب چھپا کر نہیں لکھتے۔ اس کا ڈھنڈھورا بھی نہیں پیٹتے۔ بہت زیادہ اہتمام نہیں کرتے۔ خاکہ بنانے سے لیکر آخری منزل تک دوستوں اور شاگردوں سے اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ مشورہ سے گریز نہیں کرتے۔ آسانی سے اپنی رائے نہیں بدلتے لیکن اپنی بات پر اڑتے بھی نہیں۔ جب وہ مشورہ کرتے ہیں تو ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ واقعی وہ کوئی کتاب یا مضمون لکھنے والے ہیں بلکہ یہی خیال آتا ہے کہ شاید کوئی خیال آگیا ہے اور اس پر گفتگو کر رہے ہیں لیکن سارا مواد ان کے ذہن میں یکجا ہوتا رہتا ہے۔ اب کتابیں اور مضمون لکھنے کا ذکر آگیا تو اس بات کو مکمل ہی کر دوں۔

اعجاز صاحب جو کچھ لکھتے ہیں اُس کا خاکہ زیادہ تر صبح کی سیر میں مرتب ہوتا ہے اور کئی دن تک ذہن ہی میں اس کی ترتیب ہوتی رہتی ہے۔ اس کا زیادہ حصہ سورج نکلنے سے پہلے ہی لکھا بھی جاتا ہے۔ دن کی شورش میں وہ عموماً سنجیدہ اور غور و فکر سے لکھے جانے والے مضامین کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، رات کے وقت بھی شاذ و نادر ہی لکھنے کا کام کرتے ہیں۔ چونکہ اپنے موضوع کے متعلق برابر سوچتے رہتے ہیں اس لئے جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو تیز لکھتے ہیں اور عام طور سے زیادہ کاٹ چھانٹ نہیں کرتے، مضامین کو دہراتے بھی کم ہیں اور میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ سے انھیں نقصان پہنچتا ہے۔ اس بات کا تعلق کسی حد تک اعجاز صاحب کے مزاج سے بھی ہے جس میں ایک فطری سست روی کے ساتھ ساتھ کام کو خاتمہ تک پہنچانے کی دھن کا امتزاج ایک خاص انداز سے ہوا ہے۔ اس کا اثر گفتگو، تحریر و تقریر اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

جہاں تک تصانیف کا تعلق ہے اعجاز صاحب نے اس خاموشی سے اس کام کو انجام دیا ہے کہ شاید ان کے بہت سے شاگردوں کو بھی خبر نہ ہوگی کہ اس وقت تک ان کی ہندی اردو ملا کر آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور دو ایک کتابیں زیر تصنیف ہیں جن میں سے ایک تو جلد ہی طباعت کی منزلوں سے گزرنے والی ہے۔ آئینۂ معرفت، مختصر تاریخ ادب اردو (جس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ہر ایڈیشن میں کافی ترمیم ہوتی رہی ہے) نئے ادبی رجحانات (کئی ایڈیشن) مذہب اور شاعری، ملک ادب کے شہزادے، انتخاب آتش، مہاکوی میر (ہندی)، اکبر الہ آبادی (ہندی)، یہ کتابیں تو گہرے تنقیدی مطالعہ کی دعوت دیتی ہیں لیکن مضمون کی نوعیت ان کے سرسری جائزے اور تعارف سے بھی روکتی ہے تاہم اتنا کہنا ضروری ہے کہ اردو ادب کے طالب علموں کو اعجاز صاحب سے اس سے زیادہ واقف ہونا چاہئے جتنا وہ اس وقت واقف ہیں۔ یہ تو تھا تصنیف کا ذکر جن میں ادبی مضامین شامل نہیں ہیں، جن کی تعداد کافی ہے لیکن یہ بات تو بہت ہی تھوڑے سے لوگ جانتے ہیں کہ اعجاز صاحب ایک مدت سے شاعری کی دیوی کے قدموں میں بھی اپنے قیمتی افکار چڑھاتے رہے ہیں۔ یہ کام کبھی علی الصباح تاروں کی چھاؤں میں ٹہلتے ٹہلتے ہوتا ہے۔ کشمیر، نینی تال اور مسوری کی فضا بھی شعر کہنے پر اکساتی ہے اور کئی نظمیں اسی فضا کی یادگار ہیں۔ زیادہ تر غزلیں لکھتے ہیں لیکن انہیں چھپا کر رکھتے ہیں۔ بس تھوڑے سے لوگ ہیں جنھیں ان کے اشعار سننے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی خاص مشاعرے کے لئے کسی دوست یا بزرگ کے اصرار پر کوئی غزل لکھی ہے ورنہ زیادہ تر شوق تہجد کے تقاضے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اعجاز صاحب کو شاعری کا یہ ذوق اپنے نانا سید حسین صاحب فوق مرحوم سے ملا جن کا سلسلہ تلمذ آتش سے ملتا تھا۔ اپنی شاعری کے متعلق ایک دفعہ اعجاز صاحب نے میرے ایک استفسار کے جواب میں مجھے لکھا کہ "آٹھویں درجے سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن نانا مرحوم کلام پر اصلاح دینے کے لئے راضی نہیں ہوتے تھے، کہتے تھے کہ ابھی کہتے رہو، ایف اے تک یہی حال رہا۔ جب بی اے میں پہنچا تو میری ماں کی بڑی بہن یعنی میری خالہ کے اصرار پر کبھی کبھی میری غزلیں دیکھ لیتے تھے۔ اس زمانے میں سید مہدی حسن ناصر مرحوم کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ کالج کے علاوہ ان سے گھر پر بھی ملتا تھا۔ ان کی صحبت ایک درس گاہ تھی۔ تفریحی گفتگو میں علمی مسائل، ادبی واقعات، بزرگان ادب کے تذکرے برابر آتے رہتے۔ میں

کلاس میں ان سے عربی پڑھتا تھا۔ گھر پر اردو کی باتیں ہوتیں۔ نانا کی آنکھیں جاتی رہیں تو انہوں نے میرے کلام کی اصلاح کا کام بھی باقاعدہ ناصری صاحب کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ میں نے دو سال تک اصلاح سخن میں بھی ناصری مرحوم ہی سے فیض اٹھایا۔"

یہ تو اعجاز صاحب کا بیان ہے۔ میں نے خود انھیں ہمیشہ اپنے نانا مرحوم اور ناصری صاحب مرحوم کا ذکر بڑے ادب اور جذبے کے ساتھ کرتے ہوئے سنا ہے۔ ناصری صاحب کے انتقال پر ایک پر درد مرثیہ حالی کے مرثیہ غالب کے تتبع میں لکھا تھا۔ یہ سب کچھ ہے لیکن شاعری سے اعجاز صاحب کی دلچسپی عملاً بہت گہری نہیں ہے۔ بہت کم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو کچھ کہا ہے اس کا بہت تھوڑا سا حصہ ان کے پاس محفوظ ہے۔

اعجاز صاحب کی شخصیت اور کردار کا مطالعہ کئی پہلوؤں سے کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کی تصویر کئی آئینوں میں دکھائی جا سکتی ہے ویسے تو ادب اور زبان کی خدمت اور ایک معلم کی زندگی کے مختلف پہلو ہی دو کسوٹیاں ہیں جن پر انھیں پرکھا جا سکتا ہے جو شخص انھیں ایک انسان کی حیثیت سے نظر انداز کرے گا۔ ان کے طرز زندگی اور ارتقائے ذہن کا نفسیاتی مطالعہ نہیں کرے گا وہ انھیں سمجھ نہیں سکے گا۔ اس کے لئے مختصراً ان کے حالات زندگی سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

اعجاز صاحب اگست ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ ننہال محلہ راجہ پور شہر الہ آباد میں تھا۔ اس کو اپنا گھر جانا۔ والد دنیوی لحاظ سے غریب اور کم پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اس لئے نانا ہی نے پرورش اور تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کی۔ ابتدائی زندگی ناز و نعم میں بسر ہوئی لیکن جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی گئی، گھر کی حالت خراب ہوتی گئی چار پانچ سال کے اندر والدہ اور ان کی تین بہنوں کا انتقال ہو گیا اور نہ جانے کس طرح خاندان کی مالی حالت بھی سقیم ہو گئی۔ ابتدا میں فارسی، عربی پڑھی پھر انگریزی اسکول میں نام لکھا لیا۔ ریاضی جان لیوا ثابت ہوئی اور انٹرنس میں دو سال کی ناکامیابی کے بعد کلکتہ جا کر وہاں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ کلکتہ میں زندگی تکلیف سے بسر ہوتی تھی، کبھی کبھی فاقے کی نوبت بھی آتی تھی لیکن یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے شوق نے ساری مشکلیں آسان کر دیں۔ ابھی بی اے میں داخلہ لیا ہی تھا کہ شادی ہو گئی۔ بہت زیادہ تو نہیں لیکن شادی میں کسی حد تک اعجاز صاحب کی پسندیدگی کو

بھی دخل تھا۔ اس لئے مالی دشواریوں کے باوجود یہ ذمہ داری خوشگوار تھی۔ لوگوں کے مشورے اور ضرورت اس بات پر مجبور کرتی تھی کہ نوکری کر لی جائے لیکن جب ۱۹۲۶ء میں بی اے سے فراغت حاصل ہوگئی تو آگے پڑھنے کی دھن سوار ہوئی۔ اسی زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی میں اردو ایم اے کی ابتدا ہوئی۔ اس نے شوق کو ایسا مہمیز کیا کہ تمام دشواریوں کو نظر انداز کر کے نام لکھا لیا اور ۱۹۲۸ء میں کامیابی حاصل کی۔ یونیورسٹی نے اردو ہی میں ریسرچ اسکالر بنا دیا اور سال بھر بعد لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ مالی حالت کچھ بہتر ہوئی اور خیال ہوا کہ اب ضعیف العمر نانا کی خدمت کی جائے لیکن اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔ نانا نے معمولی سی زمینداری اور کچھ مکانات چھوڑے تھے جن کے تنہا وارث اعجاز صاحب تھے۔ وہ جس مکان میں رہتے تھے وہ اچھا خاصا بڑا مگر قدیم وضع کا تھا۔ شروع میں میں نے گنگا کے کنارے کھیتوں سے کچھ ہٹ کر جس مکان کا ذکر کیا ہے وہ اسی کا ایک حصہ تھا۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے بعد یہ پرانا مکان کچھ نامناسب معلوم ہوا، کرایہ کے مکان میں رہنے سے الجھن تھی۔ اس لئے ایک مکان بنوانے کا خیال ہوا۔ اپنے پرانے مکان سے کوئی ڈسکائی تین سو گز کے فاصلے پر سڑک اس پار ایک زمین لے لی اور ۱۹۳۲ء میں مکان کی بنیاد پڑ گئی۔ یہ بس میرے وہاں پہنچنے کے فوراً بعد کی بات ہے۔ چنانچہ مکان بننے لگا اور ۱۹۳۳ء میں "نشیمن" کی صورت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

اس مکان کا ذکر کئی حیثیتوں سے اعجاز صاحب کی زندگی اور کردار کے سمجھنے میں اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے مزاج کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے کہ وہ ناامیدی میں امید اور بے سروسامانی میں سازوبرگ دیکھتے ہیں۔ یہ خیال کہ کل کیا ہوگا انھیں کسی کام سے نہیں روکتا، وہ ہر کام اس پختہ یقین کے ساتھ شروع کرتے ہیں کہ اس کا ہونا قطعی ہے۔ میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ وہ بہت سی کتابیں، کاغذ، قلم دوات اکٹھا کرتے ہوں اور پھر کسی کتاب کے لکھنے کا سلسلہ شروع کرتے ہوں۔ کتاب شروع ہو جاتی ہے اور سامان اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ یہی "نشیمن" کے بننے میں بھی ہوا۔ تین سال کی ملازمت اور تقریباً دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ میں روپیہ بچنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ دوسرے ذرائع بھی محدود تھے، مکان بنوانے کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا لیکن ایک اچھے بڑے بنگلہ کی بنیاد پڑ گئی اور تھوڑے دنوں میں ایک خوبصورت عمارت کھڑی ہو گئی۔ اگرچہ وہ بہت سی الجھنیں اپنے ساتھ لائی۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ اعجاز صاحب کے مزاج میں جو امید پرستی ہے وہ

کبھی کبھی ان عناصر کی طرف متوجہ بھی نہیں ہونے دیتی جو پیچیدگی پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی انھیں ان باتوں کی طرف متوجہ کرے تو وہ ان کی تاویل اور توجیہہ ایسی خوبصورتی سے کریں گے کہ آپ ان کے خیالات کو ٹھیس لگانے کے بجائے ان کے ہم خیال بن جائیں گے۔ چھ سال کے ساتھ میں مجھے ایسی دشواریاں برابر پیش آئیں، اس وقت تو خیر بزرگی خوردی، استادی شاگردی اور بعض دوسرے وجوہ سے کچھ زیادہ کہنا سننا آسان بھی نہ تھا لیکن اس مشکل کا اندازہ اب بھی ہوتا ہے۔ کوٹھی کو تیار ہوئے ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اعجاز صاحب کے ایک بہت ہی عزیز دوست سید ماجد علی صاحب وکیل ایک دن بڑے سویرے آگئے اور اعجاز صاحب کو اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا کر لے گئے۔ انہوں نے تقریباً بیالیس ہزار روپے قرض لئے تھے۔ مہاجنوں کو ضامن کی ضرورت تھی۔ کوٹھی نے اعجاز صاحب کی قیمت بڑھا دی تھی۔ اعجاز صاحب گئے اور ضمانت کے کاغذ پر دستخط کر کے چلے آئے۔ بعد میں لوگوں نے ہمدردانہ کہا کہ یہ بڑی غلطی ہے لیکن اعجاز صاحب عادی نہیں ہیں اور نہ انھیں کبھی اس کا خیال آیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ۱۹۳۶ء میں اچانک سید ماجد علی صاحب مرحوم کا انتقال ہو گیا اور اعجاز صاحب ایک بہت بڑی مصیبت کا شکار ہو گئے۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں جب اعجاز صاحب نے بغیر شکوہ و شکایت کے ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر، اپنا پسندیدہ مکان کرائے پر اٹھا کر برسوں میں اس قرض کا بڑا حصہ ادا کیا۔ ساری جسمانی، ذہنی اور مالی کوفت انھوں نے بڑی خاموشی سے جھیل لی۔ اپنی گھریلو ذمہ داریوں اور ضرورتوں کی وجہ سے بوجھ جتنا ہلکا ہوتا تھا اتنا ہی بڑھتا جاتا تھا، ان باتوں نے ان کی صحت اور کام کرنے کی صلاحیت پر زبردست اثر ڈالا جسے وہ اب تک بھگت رہے ہیں لیکن وہ نہ زمانے کے شاکی ہیں اور نہ ماضی کے مرثیہ خواں، نہ لوگوں کی ضرورت سے زیادہ ہمدردی سے خوش ہوتے ہیں نہ قسمت کے گلہ مند۔ انھیں مستقبل پر بھروسہ ہے اور ہمیشہ آگے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔

یہی مستقبل پرستی ان کے سیاسی تصورات میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ عملاً اور عقلاً اشتراکی نظام کے حامی ہیں۔ سیاسی کاموں میں حصہ نہیں لیتے لیکن ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے ہر اس سیاسی اقدام کو قبول کرتے اور لبیک کہتے ہیں جو ترقی پسندانہ ہو اگرچہ اس میں جذباتیت کا بھی اچھا خاصا دخل ہوتا ہے۔ اعجاز صاحب کی زندگی بہت سے قانون اور قاعدوں کی پابندی برداشت نہیں کر سکتی، سرکاری

اور غیر سرکاری ہر کام ایک غیر رسمی شکل اختیار کر لیتا ہے یعنی وہ جس کام کو بھی ہاتھ میں لیتے ہیں یا انکے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے اسے اس کے سارے غیر ضروری لوازم کے ساتھ انجام دینے کے بجائے اپنے ڈھنگ سے پورا کر دیتے ہیں اور اسی بات کی توقع دوسروں سے بھی رکھتے ہیں۔ ان کے شاگرد بڑی خوشی سے ان کے ہر کام کے لئے تیار رہتے ہیں کیونکہ وہ بھی انھیں حتی الوسع مایوس نہیں کرتے۔ یونیورسٹی میں طلبہ کی دشواریاں کیا ہیں؟ داخلہ کے شرائط میں کوئی نقص، فیس کی معافی، وظیفہ کے لئے سفارش، حاضری کی کمی اور امتحان میں شرکت کی اجازت، سعی سفارش، نوکری کی تلاش میں مشورہ اور کوشش وغیرہ اعجاز صاحب ان میں سے ہر کام کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ان کی طبیعت خراب ہو، کسی اور کام کا وقت ہو، لو دھوپ اور گرمی ہو، شدید بارش ہو رہی ہے، کڑکڑاتے جاڑے ہوں وہ دوسروں کے کام کے لئے نکل کھڑے ہوں گے۔ اپنی سی کوشش ضرور کریں گے چاہے سو فیصدی کامیابی نہ ہو۔ اپنے کام کے لئے وہ یہی امید دوسروں سے رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس کا مقصد اپنی محنت کا معاوضہ نہیں ہوتا۔

ان تمام خصوصیات میں جس خصوصیت کی سب سے زیادہ جلوہ گری ہوتی ہے وہ ان کے مزاج کی سادگی ہے۔ اس کی جھلک ان کی رفتار گفتار میں، طرز تحریر میں لوگوں سے ملنے جلنے میں، طرزِ معاشرت میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ یہ سادگی ہر ایک پر یکساں اپنا پرتو ڈالتی ہے۔ میں نے انھیں بڑے لوگوں، شاگردوں اور ادیبوں سے بھی ملتے دیکھا ہے اور راجہ پور کے ناخواندہ یا معمولی لوگوں سے بھی۔ ان کا بنیادی انداز مشکل ہی سے بدلتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں سے خود ان کی ضرورتیں وابستہ ہوں یا انھیں کوئی کام اعجاز صاحب سے ہو، چھوٹے چھوٹے لوگ اپنی ضرورت سے ان کا گھر یو نام یا محلہ کا رشتہ ظاہر کر کے ان کے پاس آئیں، وہ یکساں انہماک سے گفتگو کرتے ہوئے ملیں گے۔ اعجاز صاحب کی گفتگو کا انداز بھی مخصوص ہے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ گفتگو کرتے ہیں، اور نکتہ سنجی، خوش طبعی اور بے تکلفی کا انداز پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ طبیعت پر مزاح غالب ہے لیکن اگر بات چیت کو خوشگوار اور غیر سنجیدہ بنانے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ اس کام کو بڑی خوبی سے پورا کرتے ہیں۔ موقع نہیں ہے کہ ایسے لطیفے اور چٹکلے پیش کئے جائیں لیکن ایک واقعہ بے اختیار یاد آگیا۔

الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ ہندی میں ایک استاد ہیں ڈاکٹر رام کمار ورما، ہندی کے بڑے اچھے ادیب، شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں۔ اعجاز صاحب کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے اداشناس ہیں۔ میں اس کا مدعی تو نہیں لیکن کبھی کبھی ان کی صحبتوں میں بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔ ایک دن میں اعجاز صاحب کے ساتھ تھا، راستہ میں ڈاکٹر رام کمار ورما کی کوٹھی پڑتی تھی، ان کے یہاں پہنچ گئے۔ ایک صاحب پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی سرکاری افسر یا رئیس معلوم ہوتے تھے۔ ورما صاحب نے بے تکلف انداز میں اعجاز صاحب کا خیر مقدم کیا اور کہا بھئی کئی دن سے ملاقات نہیں ہوئی کیا کرتے رہتے ہو۔ اعجاز صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا، اب تمھیں کیا بتاؤں، وہ جو تمھارے گورنر صاحب بہادر ہیں، ہیگی، وہ آگئے اور پیچھے پڑ گئے کہ شکار میں چلو۔ کتنا جھوٹ بولا، بہانے کئے، وہ کمبخت نہ مانا، اور پھر اگر معاملہ شکار ہی تک ہوتا تو کوئی بات نہ تھی، کہنے لگا چھوڑ دو یونیورسٹی میں تمھیں براہ راست کلکٹر بنوائے دیتا ہوں۔ بڑی مشکل میں جان ہے، کیا کروں، اس کی دوستی تو وبال جان بن گئی ہے، جب دیکھو دروازے پر کھڑا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ورما تو اعجاز صاحب کی باتوں کے انداز سے واقف ہی تھے، انھوں نے بھی کہا، مارو گولی کلکٹری پر کہاں جاؤگے ہم لوگوں کو چھوڑ کر۔ بات اسی انداز میں ہو رہی تھی اور جو صاحب بیٹھے تھے، وہ حیران کہ آخر یہ کون شخص ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ ان کو حیرت ہی میں چھوڑ کر ہم لوگ چلے آئے۔ دوسرے دن وہ صاحب اعجاز صاحب کے یہاں آموجود ہوئے اور پیچھے پڑ گئے کہ رائے بہادری کے لئے میری سفارش گورنر صاحب سے کر دیجئے۔ انھیں لاکھ یقین دلایا گیا کہ یہ محض مذاق تھا، مگر وہ کسی طرح نہ مانے۔ آخر اعجاز صاحب نے ان سے جھوٹا وعدہ کر لیا۔ پھر مجھے یاد نہیں کیا گزری ——— ایسے دلچسپ قصے برابر پیش آتے رہتے ہیں اور کبھی کسی بزم کو بے کیف اور خشک نہیں بننے دیتے۔ ان کا مزاج مرنجاں مرنج ہے، اور جان بوجھ کر کسی کو تکلیف پہنچانا ان کی فطرت کے خلاف ہے۔ انھوں نے ایک زمانہ میں تصوف کا مطالعہ کیا، مذاہب کے ظاہری لوازم سے گزر کر ان کی بنیادی یک رنگی پر غور کیا اس لئے ان کے مزاج میں ایک خاص قسم کی فراخ دلی پائی جاتی ہے۔ مذہب رنگ، روپ، دولت و افلاس کی بنیاد پر وہ انسانوں میں تفریق نہیں کرتے، بلکہ ان کی اخلاقی زندگی اور انسانی صلاحیتوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صبح خوشگوار ہو اور ٹہل کر واپس آجانے کے بعد بھی سورج نہ نکلے۔ مناظر فطرت کی دلفریبی دل نشین ہو تو وہ صبح کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ تصوف نے

ان کے کردار اور خیالات پر گہرا اثر چھوڑا ہے جس کے اچھے اخلاقی پہلو اُن کی زندگی میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ کہا گیا، اعجاز صاحب بہت سی پابندیوں سے گھبراتے ہیں اور مہدی افادی کی زبان میں "عوائد رسمیہ" کے قائل نہیں ہیں اسی وجہ سے بڑی بڑی کانفرنسوں میں، شادی بیاہ میں، مجالس و محافل میں، جہاں دیر تک بے قابو ہو کر بیٹھنا پڑے اور دوسروں کے ہاتھ میں وقت کی لگام ہو، شرکت سے گھبراتے ہیں۔ اگر شریک ہونا ہی پڑے تو کسی وقت چپکے سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور وقت کی لگام خود اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے مسلسل کسی کام میں لگے رہنا ان کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں ان باتوں سے دلچسپی نہیں ہے۔ مگر جس شخص کو ان سے ملتے رہنے کا اتفاق ہوا ہے وہ ان کی اکتاہٹ کا سبب آسانی سے معلوم کر لیتے ہیں۔

اعجاز صاحب ایک استاد کی حیثیت سے غیر معمولی جذب و کشش کے مالک ہیں۔ انھیں اپنے شاگردوں پر بھروسہ رہتا ہے اور شاگردوں کو ان پر۔ ان کا بے تکلف اور ریا و تصنع سے خالی انداز ان کے طالب علموں کو ان کے قریب لاتا ہے اور یہ قرب محض رسمی ملاقات سے گزر کر عزیزدارانہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے شاگردوں کے ذہن میں ان کی ادبی اور انسانی حیثیت اس طرح گڈمڈ ہو جاتی ہے کہ وہ انھیں جدا نہیں کر سکتا۔ ان کی ایک کمزوری کا تکملہ دوسری خوبی سے ہوتا ہے اور نتیجہ میں ان کی شفیق اور ہمدرد شخصیت ذہن پر چھا جاتی ہے۔ انسانی ہمدردی کا ایک بڑا حصہ ان کو ودیعت ہوا ہے۔ وہی غلطیوں کا ارتکاب بھی کراتا ہے، کمزوریوں کے روپ میں بھی ظاہر ہوتا ہے لیکن ان سے قریب رہنے والوں کو معلوم ہے کہ اس کے پیچھے کوئی اخلاقی نقص نہیں ہے۔ میں پھر عرض کروں گا کہ کوئی شخص الہ آباد جائے اور اعجاز صاحب سے نہ ملے تو اس کی بد ذوقی اور لاعلمی پر مجھے افسوس ہوگا۔

قتیل شفائی

گاتے ہوئے پیڑوں کی خنک چھاؤں سے آگے نکل آئے
ہم دھوپ میں چلنے کو، تیرے گاؤں سے آگے نکل آئے

ایسا بھی تو ممکن ہے، ملے بے طلب اک مژدۂ منزل
ہم اپنی دعاؤں سے تمنّاؤں سے آگے نکل آئے

کہتے ہیں کہ ان جسموں کو اک رُوحِ مُقدس کی دُعا ہے
وہ جسم کہ جو اپنے تھکے پاؤں سے آگے نکل آئے

تھوڑا سا بھی جن لوگوں کو عرفانِ مذاہب تھا، وہ بچ کر
کعبوں سے، شوالوں سے، کلیساؤں سے آگے نکل آئے

تھے ہم بھی ہوس کار، ہر اک زاہدِ مکار کی صورت
بازار میں بکتی ہوئی سلماؤں سے آگے نکل آئے

شہروں کے مکینوں سے ملی جب ہمیں وحشت کی ضمانت
ہم سی کے گریبانوں کو، صحراؤں سے آگے نکل آئے

بنتی رہی اک دنیا قتیلؔ اپنی خریدار ـــ مگر ہم
یوسف نہ بنے اور زلیخاؤں سے آگے نکل آئے

سجاد باقر رضوی

دنیا دنیا سیرِ سفر تھی، شوق کی راہ تمام ہوئی
اس بستی میں صبح ہوئی تھی اس بستی میں شام ہوئی

کیسی لہر ہے سرد ہوا کی سارے ٹھٹھرے بیٹھے ہیں
کل تک تو بس ہم چپ چپ تھے آج خموشی عام ہوئی

موسم بدلے دل کا سورج دکھ کی گھٹا میں ڈوب گیا
پیار کے لیل و نہار نہ پوچھو شام سے پہلے شام ہوئی

درد کی برکھا ٹوٹ کے برسی پھوٹ بہے پلکوں کے بند
اس بارش میں وضعِ وفا کی ہر کوشش ناکام ہوئی

ہلکی سی اک لہر تھی اب وہ طوفاں بن کر ابھری ہے
اک بے نام خلش تھی پہلے اب وہ تیرا نام ہوئی

تیرے سر پر رات کی رانی مہک کر پھول بنی
میرے سر میں پھول کی خوشبو شورش کا پیغام ہوئی

چھوٹا سا وہ دل کا ٹکڑا کیا کیا فصلیں دیتا تھا
حیف قمارِ عشق کے کارن کیسی زمیں نیلام ہوئی

پہلے تو اک سایہ ابھرا پھر سایہ تصویر بنا
اب وہ شکل مری دیوار پہ گویا نقشِ دوام ہوئی

ایک عمل کے دو پہلو آوازِ سلاسل، جذب کی چپ
وہ بھی میرے نام ہوئی تھی یہ بھی میرے نام ہوئی

اہلِ ہنر کی دنیا طلبی، شوقِ شہادت کیا کرتی
اک تلوار تھی عرضِ ہنر کی وہ بھی زیبِ نیام ہوئی

باقر تم سید زادے ہو سر کو اٹھائے پھرنا کیا
شوق و طلب کی حجت آخر، آخر کار تمام ہوئی

خلیل الرحمٰن اعظمی

دل کی رہ جائے نہ دل میں یہ کہانی کہہ لو
چاہے دو حرف لکھو چاہے زبانی کہہ لو

میں نے مرنے کی دعا مانگی وہ پوری نہ ہوئی
بس اسی کو مرے جینے کی نشانی کہہ لو

صرصرِ وقت اڑا لے گئی رُودادِ حیات
وہی اوراق جنھیں عہدِ جوانی کہہ لو

جب نہیں شاخِ چمن پر تو مرا نام ہی کیا
برگِ آوارہ کہو، برگِ خزانی کہہ لو

تم سے کہنے کی نہ تھی بات مگر کہہ بیٹھا
اب اسے میری طبیعت کی روانی کہہ لو

وہی اک قصہ زمانے کو مرا یاد رہا
وہی اک بات جسے آج پرانی کہہ لو

ہم پہ جو گذری ہے بس اس کو رقم کرتے ہیں
آپ بیتی کہو یا مرثیہ خوانی کہہ لو

جمیل مظہری

زلفوں پہ گردِ راہ کی صحرا میں تو کہاں
اے جانِ قیس! قیس کی دنیا میں تو کہاں

یہ کاروبارِ درد و تپش ہے خودی کا کام
اے بیخودی مقامِ تمنا میں تو کہاں

لائے گا تو مشاہدۂ مو بہ مو کی تاب
اے نازِ حسن دیدۂ بینا میں تو کہاں

اے حرفِ یاس اے لبِ واعظ تری جگہ
شاعر کے اس صحیفۂ فردا میں تو کہاں

ایسا بھی کیا کہ اپنی نظر کا فریب کھائیں
جلوے ہیں تیرے چشمِ تماشا میں تو کہاں

جینا ہے تجھکو عشق تو بے رنگ ہو کے جی
نیرنگیٔ مزاجِ تمنا میں تو کہاں

ساحل پہ بیٹھ موج کی اٹکھیلیوں کو دیکھ
اے مظہری تلاطمِ دریا میں تو کہاں

سکندر علی وجد

زندگی رقص میں ہے ساقیٔ گلفام کے ساتھ
نبضِ کونین لرزتی ہے خطِ جام کے ساتھ

ہاں اسی دور میں پینے کا مزا ہے یارو
بڑھ گئی تلخیٔ مے تلخیٔ ایام کے ساتھ

غیرتِ لطفِ تکلم تھے خموشی کے مزے
عاشقی رسم بنی نامہ و پیغام کے ساتھ

مدتیں بیت گئیں عہدِ جنوں کو لیکن
یاد آتا ہے مزا نام ترے نام کے ساتھ

رند سرشار کے مانند چلا جاتا ہوں
سیلِ افکار پہ اک موجِ دلِ آرام کے ساتھ

جس طرح موجِ صبا راہبرِ نکہتِ گل
وجد نسبت ہے یہی شعر کو الہام کے ساتھ

سید حرمت الاکرام

لائیں کہاں سے خندۂ گل کا دماغ ہم
سینے پہ سے کے آئے ہیں لالے کا داغ ہم
دیتے ہیں نور، سوزِ محبت کا عقل کو
رکھتے ہیں شمعِ دل سے منور دماغ ہم
کیا کیا دعائیں دیتی ہے گیتی کی تشنگی
مہکا رہے ہیں فکر و نظر کے ایاغ ہم
درماندگانِ شب سے یہ کہدو بڑھے چلیں
روشن کئے ہوئے ہیں دلوں کے چراغ ہم
کیوں مسکرا کے دیکھ رہی ہے ہمیں خزاں
مدت ہوئی، اجاڑ چکے اپنا باغ ہم
تاریکیوں کے دشت میں اک کھیل ہی سہی
آؤ جلا جلا کے بجھائیں چراغ ہم
اس روشنی میں ملتی ہے منزل کی رہگذر
پاتے ہیں تجھ کو دیکھ کے اپنا سراغ ہم
حرمت شعورِ غم کا بھی لازم ہے احترام
کیوں زندگی میں ڈھونڈ رہے ہیں فراغ ہم

ناصر کاظمی

جب رات گئے تری یاد آئی سو طرح سے جی کو بہلایا
کبھی تیری یاد سے باتیں کیں کبھی اپنے ہی دل کو سمجھایا

جب پہلے پہل تجھے دیکھا تھا دل کتنے زور سے دھڑکا تھا
وہ لہر نہ پھر دل میں جاگی وہ رنگ نہ لوٹ کے پھر آیا

یونہی وقت گنوایا موتی سا یونہی عمر گنوائی سونا سی
اب تجھ سے بچھڑ کے سوچتا ہوں تجھے پا کے بھی میں نے کیا پایا

پھر آج ترے دروازے پر بڑی دیر کے بعد گیا تھا مگر
اک بات اچانک یاد آئی میں باہر ہی سے لوٹ آیا

اقبال منہاس

اب کسی چیز کا معیار نہیں ہے کوئی
ان گنت دوست ہیں غمخوار نہیں ہے کوئی
زندگی دھوپ ہے تپتے ہوئے صحراؤں کی
دوستو سایۂ دیوار نہیں ہے کوئی
دل میں بس جائے جو بن کر تری خوشبوئے بدن
پھول وہ زینتِ گلزار نہیں ہے کوئی
مجھ کو ہر موڑ پہ اک زخم نیا دیتی ہے
زندگی مجھ سے تجھے پیار نہیں ہے کوئی
ہم تو آئے تھے یہاں جنسِ دل و جاں لیکر
کیا کریں ان کا خریدار نہیں ہے کوئی
کتنے یوسف ہیں کہ جن کی نہیں قیمت کوئی
ہائے اب مصر کا بازار نہیں ہے کوئی
آپ منزل کا تعین تو کریں اے اقبال
ہمرہی سے مجھے انکار نہیں ہے کوئی

ساقی فاروقی

میں وہی دشت ہمیشہ کا ترسنے والا
تو مگر کون سا بادل ہے برسنے والا

سنگ بن جانے کے آداب سکھائے میں نے
دل عجب غنچۂ نورس تھا بکنے والا

حسن وہ ٹوٹتا نشہ کہ محبت مانگے
خون روتا ہے مرے حال پہ ہنسنے والا

جانے یہ کون سی نیکی مرے کام آئی ہے
ورنہ وہ شعلۂ عصیاں تھا جھلسنے والا

وہ خدا ہے تو مری روح میں اقرار کرے
کیوں پریشان کرے دور کا بسنے والا

فضیل جعفری

اشکوں کو رد کیے کبھی دل کو سنبھالیے
کس کس طرح سے درد محبت کو ٹالیے

حسرت سے دیکھتے ہیں درختوں کو راہ میں
فرصت کہاں کہ بیٹھ کے حسرت نکالیے

ہم سے کبھی اے صبا، کبھی پل بھر ہو گفتگو
پھرتے ہیں ہم بھی دولت زخم وفا لیے

ہر بات دوسروں کے لیے اک سوال ہے
محفل میں بات، سوچ سمجھ کر نکالیے

ہر شخص کے خلوص پہ کیجیے نہ اعتبار
سانچے میں اپنے جعفری سب کو نہ ڈھالیے

اختر نظمی

یادوں کے بادل گھر آئے
ہو گئے گہرے درد کے سائے

ترک وفا کی بات کہیں کیا
دل میں ہو تو لب تک آئے

چلتے رہیے منزل منزل
اُس آنچل کے سائے سائے

اس کا پیکر موجِ بہاراں
موجِ بہاراں ہاتھ نہ آئے

دُور نہیں تھا شہرِ تمنا
آپ ہی میرے ساتھ نہ آئے

میرے جنوں کی راہ گزر میں
ہوش و خرد نے دام بچھائے

بزم اپنی ماحول انجانا
شہر اپنا اور لوگ پرائے

میری صدا پر شاید بستی
کروٹ لے اور پھر سو جائے

خواب ہیں نظمی زیست کا حاصل
خواب مگر کچھ کام نہ آئے۔

راج نرائن راز

تلخیاں زہر کی نمایاں ہیں
پھول خنداں ہیں قلب گریاں ہیں

بات بے بات، آنکھ میں آنسو
دل میں کیا جانے کتنے ارماں ہیں

زندگی، اسقدر بخیل ہے کیا
ارز ذکر کے ہم پشیماں ہیں

کس طرح گھر میں روشنی کی ہے
در و دیوار خود بھی حیراں ہیں

ہم سے قائم سہاگ دھرتی کا
ہم کہ یزداں نہیں ہیں انساں ہیں

ساتھ دُنیا کا! راز کیا کہیے
ساز ٹوٹا ہے، ہم غزلخواں ہیں

شفیق الرحمن

کون کیا ہے؟

WHO IS WHO ?

نوٹ :- دنیا بھر میں "کون کیا ہے"، کے عنوان سے مشہور آدمیوں کے حالاتِ زندگی ہر سال چھپتے ہیں جنھیں لوگ شوق سے پڑھتے ہیں مگر کچھ تشنگی سی رہ جاتی ہے۔ کیوں کہ صرف ان ہستیوں کا ذکر کیا جاتا ہے جنھیں پبلک پہلے سے جانتی ہے۔ اور پھر زمانہ بدل چکا ہے۔ قدریں بھی بدل چکی ہیں۔ ان دنوں لوگ کسی دوسرے کے حالاتِ زندگی کی سرخیوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے بلکہ وہ "کچھ اور" باتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

از بر رومانی

سنہ ۱۹۳۰ء میں جوان ہوئے۔

آپ کے شاعر بننے کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں۔ سنا ہے کہ سنہ ۳۰ء میں کسی لڑکی پر خوامخواہ عاشق ہو گئے تھے۔ محبوب نے شاعری کی قدیم روایات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہیں خوب ستایا اور سنہ ۳۱ء میں کہیں غائب ہو گئی۔ محبوب کے چلے جانے کے بعد ان کی زندگی بالکل سنسان رہ گئی، کچھ بھی نہ رہا —— سوائے ان کی بیوی اور دو بچوں کے۔

بڑے نازک مزاج ہیں۔ ایک دعوت میں سری پائے نوش فرمائے تو فوراً سر میں درد ہو گیا اور پاؤں میں موچ آ گئی۔

رومانی چیز کہتے ہیں جو "مست قلندر"، "جنسی دنیا"، "لطفِ زندگی" جیسے بلند پایہ ادبی رسالوں کی زینت بنتی ہیں۔

آپ بڑے ہر دلعزیز ہیں۔ بڑی بڑی محفلوں میں جل چکے ہیں ــــ فقط ایک مرتبہ۔

آپ کو جدید شاعری سے نفرت ہے چنانچہ "زنداں"۔ "خرابے"۔ "زہراب" "خوناب" "سامراج"۔ "طبقاتی شعور"۔ "عظمت آدم"۔ "ذلت مردم" ــــ ان سب چیزوں کے پاس نہیں پھٹکتے۔

اظہر سماجوی

آپ بھی شاعر ہیں اور "زنداں"۔ "خرابے"۔ "زہراب"۔ "خوناب"۔ سامراج"۔ "طبقاتی شعور" "عظمتِ آدم"۔ "ذلت مردم" ــــ ان سب چیزوں پر جان چھڑکتے ہیں۔

آئی۔ کیو۔ خاں۔ گوالیاری

جو کچھ دیکھتے یا سنتے ہیں اس پر یقین نہیں کرتے۔ آپ کا زیادہ وقت ان چیزوں کے متعلق سوچنے میں گزرتا ہے جو کہیں نہیں ہیں۔

۱۹۲۵ء میں آپ نے اپنی معرکتہ الآراء سوانح عمری "انسان یا جانور؟" (اپنے خرچ پر) چھپوائی۔ آپنے انسانی جسم پر تنقید کی کہ اکثر اعضا غلط فٹ کئے گئے ہیں۔ پیٹ جیسا ملائم حصہ آگے نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ اس پر خوامخواہ ضرب لگانے کو جی چاہتا ہے۔ اسی طرح گھٹنے اور پنڈلی کا اگلا حصہ سخت ہے اور بار بار میز کرسیوں سے ٹکراتا رہا۔ اگر یہ عقب میں ہوتا تو بہتر تھا کان اور دم کے پٹھے ابھی تک انسانی جسم کا حصہ ہیں۔ ظاہر ہے یہ پٹھے کسی زمانے میں کان اور دم ہلانے کے لئے استعمال ہوتے ہوں گے۔ ہم اپنے آپ کو چوپایوں سے محض اس لئے بہتر سمجھتے ہیں کہ ہم اگلی دو ٹانگیں اٹھا کر سیدھے کھڑے ہو گئے ہیں۔ اور ان اگلی ٹانگوں کو بازو کہتے ہیں۔ بے چارے گھوڑے اس طرح کھڑے ہونے کی کوشش کبھی کبھی (ہارس شو میں) کرتے ہیں لیکن ناکام رہتے ہیں۔ ویسے کسی دن وہ ضرور کھڑے ہو جائیں گے۔

گھوڑے انسان سے زیادہ عقلمند ہیں۔ جہاں انسان گھوڑے پر شرطیں بدتا ہے وہاں گھوڑا کبھی انسان پر ایک روپے کی شرط بھی نہیں لگاتا۔ نیز گھوڑوں کی HORSE SENSE مشہور ہے۔ آپ نے ایک دلچسپ واقعہ درج کیا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں آپ کو یہ وہم ہو گیا کہ آپ نے

سالم گھوڑا نگل لیا ہے۔ بہت جلد اس وہم نے مرض کی صورت اختیار کر لی۔ ہر وقت پیٹ میں درد رہنے لگا۔ گھوڑے کی خاطر آپ گھاس بھی کھاتے۔ کسی اور کو یہ شکایت لاحق ہو جاتی تو اسے پاگل گردانتے۔ لیکن آپ فلاسفر تھے۔ آپ کو علاج کے لئے ولایت بھیجا گیا۔ ایک مشہور ماہر نفسیات کے کہنے پر آپ کا آپریشن ہوا۔ سرجن نے آپ کو بے ہوش کیا۔ پیٹ پر چند خراشیں لگا کر پٹی باندھی اور ایک گھوڑا منگوا کر آپریشن تھیٹر میں کھڑا کر دیا۔ ہوش آنے پر سرجن نے آپ کو سمجھایا کہ پیٹ میں واقعی گھوڑا ہی تھا جسے بڑی مشکل سے اپریشن کے بعد نکالا گیا ہے۔ آپ نے گھوڑے کو دیکھ کر چیخ ماری ــــ یہ گھوڑا تو مشکی ہے۔ میں نے سفید گھوڑا نگلا تھا۔

سنا جاتا ہے کہ ایک ۔ ۰ کے بعد وہ ماہر نفسیات پاگل ہو گیا۔

افسوس ہے کہ آپ کی کتاب زیادہ مقبول نہیں ہوئی۔ ان دنوں آپ "جانور یا انسان" لکھ رہے ہیں۔

اے ۔ کے مداری

جب پیدا ہوئے تو والدین کو کچھ عرصے کے لئے کافی فخر رہا۔ بچپن میں اکثر لوگ ہونہار معلوم ہوا کرتے ہیں۔

سنہ ۲۲ء میں پہلا مضمون لکھا۔ سنہ ۲۲ء میں سکول چھوڑنا پڑا۔

سنہ ۳۵ء میں فرسٹ ایر کی تعلیم۔ سنہ ۳۶ء کالج سے بھاگنا۔ سنہ ۳۶ء میں حیرتی صاحب سے دوستی (حیرتی صاحب کو تلاش کے سلسلے میں بھیجا گیا تھا) سنہ ۳۷ء دوسرے کالج میں فرسٹ ایر کی تعلیم سنہ ۳۸ء کالج سے بھاگنا۔ سنہ ۳۸ء مدہوش صاحب سے دوستی (جو انہیں ڈھونڈ کر لائے) سنہ ۳۹ء تیسرے کالج میں فرسٹ ایر کی تعلیم۔ سنہ ۴۰ء کالج سے بھاگنا۔ سنہ ۴۰ء سیلانی صاحب سے دوستی۔

اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اور آپ کو اور متعلقہ حضرات کو بھاگنے اور تلاش کرنے کی عادت سی پڑ گئی۔ چنانچہ جس سال آپ نہ بھاگتے لوگ تعجب کیا کرتے۔

آپ کو ہمیشہ غلط سمجھا جاتا ہے۔ پہلی مرتبہ ملنے پر لوگ کچھ اچھا اثر قبول نہیں کرتے اور آپ کو زیادہ پسند نہیں کرتے ــــ لیکن جب اچھی طرح جاننے لگیں تو آپ سے نفرت کرتے ہیں۔

جیسے کئی لوگ دوست بنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ آپ کو اجنبی بنانے میں خاص مہارت حاصل ہے چنانچہ آپ کے گنے گنائے دوست وہی چند حضرات ہیں جو آپ کو پکڑ لائے تھے (آپ کا یہی خیال ہے کہ وہ آپ کے دوست ہیں)۔

آپ کو ہجوم سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ اب بھی زیادہ سے زیادہ چار پانچ انسانوں کی موجودگی برداشت کر سکتے ہیں۔ چھٹا آدمی آجائے تو فوراً غائب ہو جاتے ہیں۔

آپ نے پہلی کتاب "بلیک بورڈ" ۱۹۴۲ء میں لکھی۔ اس میں ڈسٹرکٹ بورڈ کی دھجیاں اڑائیں اور اسے سوسائٹی کی بیشتر خرابیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا (ڈسٹرکٹ بورڈ نے آپ کو اپنے عشائیہ پر مدعو نہیں کیا تھا)۔ "الناشر" ۱۹۴۵ء میں لکھی جس میں ناشرین کو خوب برا بھلا کہا (ناشرین نے آپ کی چیزیں چھاپنے سے انکار کر دیا تھا)۔ اتفاق سے آپ کی ایک کتاب بھی نہیں چھپی۔

بیک وقت ترقی پسند، رجعت پسند، شر پسند اور صلح پسند ہیں۔ آپ کے خیال میں زندگی کی صحیح قدریں وہ ہیں جو زمانے کی تسلیم شدہ قدروں سے بالکل مختلف ہوں۔ یعنی ہر شخص کی اپنی پرائیویٹ قدریں ہونی چاہئیں۔

آپ کے رویّے کا دارومدار آپ کے جگر اور معدے پر ہے جس دن یہ دونوں اعضا صحیح کام کریں (جو کبھی کبھی ہوتا ہے) تو بڑے مخلص معلوم ہوتے ہیں۔ جب فتور آتا ہے (جو اکثر آتا ہے) تو پہچانے نہیں جاتے۔

آپ کا قول ہے کہ آرٹسٹ کا دماغ عام انسان کے دماغ سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے اسکی حرکتیں بھی عجیب ہونی چاہئیں۔ ایک صحیح آرٹسٹ بننے کی جتنی کوشش آپ نے کی ہے شاید صحیح آرٹسٹوں نے کبھی نہ کی ہوگی۔

شاید آپ نہیں جانتے کہ خدا گناہ معاف کر دیتا ہے لیکن نظام اعصابی کبھی معاف نہیں کرتا۔ تبھی آپ دن بدن عصبی المزاج ہوتے جا رہے ہیں۔ اور آپ کے چہرے پر ہر وقت وہ اظہار رہتا ہے جو بیرنگ لفافے پر ہوتا ہے۔

۱۹۴۰ء میں شادی کرنے کا ارادہ تھا لیکن بدقسمتی سے منگیتر پاگل ہو گئی۔ ۱۹۴۲ء میں ایک

شادی شدہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن خوش قسمتی سے خود پاس ہو گئے۔

ان دنوں پتہ نہیں کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

بلند اقبال ملک

آپ کا نام بلند بخت یا قطب الدین یا کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ نام میں کیا دھرا ہے۔

آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن سے مل کر محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ آج نہ ملتے تو کل، پرسوں مل جاتے۔ صبح دس بجے اٹھتے ہیں، حقہ نوش فرما کر نائی سے حجامت کرانے کے بعد کار میں سوار ہوتے ہیں اور یہ معلوم کرنے باہر نکل جاتے ہیں کہ یار لوگ بھی جاگ اٹھے ہیں یا نہیں۔ مرغن لنچ کے بعد کچھ دیر اونگھتے ہیں پھر سو جاتے ہیں۔ شام کو کبھی کبھی مکانوں، دکانوں اور زمینوں کا حساب کرتے ہیں ورنہ اسفر سڑکوں کی پیمائش کیا کرتے ہیں۔ مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں بہت پسند ہیں۔ کبھی کبھی مسلم سوشل فلم بھی دیکھتے ہیں۔

صحت ماشاء اللہ ایسی ہے کہ وٹامنز انھیں استعمال کرنا چاہیں تو کر لیں۔ انھیں وٹامنز کی کوئی ضرورت نہیں۔ یونیورسٹی سے ڈگری نہیں لے سکے۔ غالباً تھرڈ ماسٹر سے ڈگری لے سکتے ہیں۔ ہر قسم کے تجربے سے نفرت ہے۔ اکثر کہا کرتے ہیں کہ کئی آدمیوں کے پاس تجربے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ چونکہ خوش خوراک ہیں اس لئے خوش مزاج ہیں۔ ہر وہ واقعہ جو کسی دوسرے پر بیتے انھیں مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں سے سولہ گھنٹے سو کر گزارتے ہیں اور اتنے زور سے خراٹے لیتے ہیں کہ خود جاگ اٹھتے ہیں۔

سنہ ۳۱ء میں بٹیر بازی کا شوق تھا۔ سنہ ۳۳ء میں کبوتروں کا۔ سنہ ۳۵ء میں مرغ لڑانے کے فن سے رغبت ہوئی۔ سنہ ۳۷ء شکاری و دیگر قیمتی کتے۔ سنہ ۳۹ء گھوڑوں میں دلچسپی لینے لگے (گھڑ دوڑ میں سواری میں نہیں)۔ سنہ ۴۱ء میدان سیاست میں قدم رکھا۔ سنہ ۴۲ء قدم واپس اٹھا لیا لیکن سنہ ۴۳ء میں جب ان کا ایک دوست میونسپلٹی کا صدر منتخب ہوا تو فوراً رزم گاہِ سیاست میں کود پڑے۔ سنہ ۴۴ء میں سفید پوشی درجہ اول کا اعزاز پیش کیا گیا (جو آپ نے اسی وقت قبول کر لیا) تب سے اب تک کھانے اور سونے سے جو وقت بچتا ہے اسے ملک کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔

ہر وقت زندگی کی بیشمار مصروفیتوں اور عدیم الفرصتی کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ ڈھوک پیر بخش میں بستے تھے (ویسے ان کا پیر دس میل کے فاصلے پر رہتا ہے) وہیں ہیں اور عمر بھر وہیں رہینگے۔

بی۔ ایل مفکر

ایام طفلی میں (ضرورت سے زیادہ) ذہین تھے اور غور و خوض کی عادت تھی۔ جس نے بعد میں تجسس و تشویش کی شکل اختیار کی۔ اور اب آپ ہر وقت کسی نہ کسی فکر میں غلطاں رہتے ہیں۔ "گھر کا طبیب"۔ "گھریلو ڈاکٹر"۔ "خانگی وید"۔ بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان میں سے ایک مہلک بیماری منتخب کر کے اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس وقت تک مبتلا رہتے ہیں جب تک اس سے بہتر مہلک بیماری نہیں مل جاتی۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں دق کے مریض رہے۔ پھر کسی نے بتا دیا کہ دق کا تو علاج ہو سکتا ہے چنانچہ سنہ ۱۹۴۱ء میں اپنے لئے ضعف دل تجویز فرمایا۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں خون کے دباؤ کی شکایت رہی۔ سنہ ۱۹۴۳ء سے سنہ ۱۹۴۴ء تک گردے کی بیماریاں (ایک ایک کر کے سب) پھر کہیں پڑھا کہ جگر کی رسولی بڑی خطرناک ہوتی ہے اس لئے سنہ ۱۹۴۵ء میں جگر کی رسولی۔

اب تک متعدد جان لیوا بیماریوں کے مریض رہ چکے ہیں۔

معمولی سے معمولی عارضے کا جب تک بڑا سا سائنٹفک نام تلاش نہ کر لیں مطمئن نہیں ہوتے۔ خدا کے فضل سے صاحب دولت ہیں اس لئے انواع و اقسام کے عارضوں میں مبتلا ہونے کی توفیق رکھتے ہیں۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں ایک مشہور طبیب روحانی کے زیر علاج رہے جن کا دعویٰ تھا —— تین ماہ میں شرطیہ شفا، ورنہ مرض واپس۔

چونکہ تقریباً ساری بیماریاں ختم ہو چکی ہیں اس لئے اب اور باتوں کی فکر کرتے رہتے ہیں۔ فلاں کیا کہے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ کہیں فلاں نہ سُن لے۔ ہائے یوں کیوں نہ ہوا۔ وغیرہ

آج کل یہ فکر لاحق ہے کہ ملک میں (کہیں سے) ایک زبردست ادبی انحطاط آیا ہوا ہے۔ اس غم سے راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔

چہرے کی جھریوں کی نکر الگ رہتی ہے۔

پدرم سلطانی

آپ نے گھر میں جگہ جگہ تلواریں، ڈھالیں، پیش قبض، پستول اور خنجر سجا رکھے ہیں۔ دیواروں پر بے شمار پرانی تصویریں آویزاں ہیں جن میں سب سے نمایاں چیز مونچھیں ہیں۔ آپ کا محبوب ترین مشغلہ خاندان کے افراد کے کارنامے سنانا ہے۔ یہ نعل تب کی ہے جب دادا جان کے دادا جان محاصرہ جین میں لڑے تھے (محاصرین اور محصورین دونوں سے) گھوڑے نے دولتی رسید کی اور نعل گر پڑی جو انھوں نے (آئندہ نسلوں کے لئے) فوراً اٹھا کر جیب میں رکھ لی۔ یہ تلوار جنگ ہنومان گڑھ میں استعمال ہوئی تھی۔ پردادا کے چچا نے اس سے ایک گھوڑا ہلاک کیا۔ سوار گھوڑے کے نیچے دب گیا۔ اس پستول سے خسر صاحب کے دادا جان نے ایک شیر کو مارنا چاہا لیکن شیر کی خوش قسمتی ملاحظہ ہو کہ گولی شیر سے چھ انچ اس طرف ٹھنڈی ہو گئی۔ اس بڑی ڈھال سے دادا جان کے خسر نے پچاس آدمیوں کا مقابلہ کیا۔ لطف یہ ہے کہ جب دشمنوں میں سے کسی نے ڈھال کھینچ کر ایک طرف کی تو اس کے پیچھے کوئی بھی نہیں تھا (دادا جان کے خُسر موقع پا کر فرار ہو چکے تھے) خود دادا جان نے (بطور ٹھیکیدار) کئی لڑائیوں میں حصہ لیا۔ پہلی جنگ عظیم میں کلکتے میں لڑے (ٹھیکیداروں سے) مدراس میں بڑی جوانمردی سے دشمن (حریف ٹھیکیداروں) کا مقابلہ کیا۔ بڑے بڑے ممتاز جنرلوں کے ساتھ رہے (سب سے بڑے یہ ان کے تمغے ہیں (جو انھوں نے کسی کباڑیئے سے خریدے)۔

سن ۴۳ء میں کسی قنوطی دوست نے آپ کو ڈرایا کہ اگر چور گھر میں گھس آئے تو کہیں یہی ہتھیار گھر والوں پر استعمال نہ کر بیٹھے۔ اب آپ نے سب چیزیں ایک کمرے میں بند کر کے قفل لگا دیا ہے۔ اور بزرگوں کی دریا دلی کے قصے شروع کر دیئے ہیں۔ فلاں بزرگ ہاتھی پر سیر کو جا رہے تھے۔ فقیر نے سوال کیا۔ آپ نے فوراً ہاتھی اس کے حوالے کیا اور خود پیدل چلے آئے۔ فلاں بزرگ رضائی اوڑھے کہیں جا رہے تھے کسی نے رضائی کی تعریف کی آپ نے فوراً اتار کر اس کے حوالے کی اور بغیر رضائی کے واپس چلے آئے۔ (بعد میں باہر جانا بند کر دیا تھا۔ سال میں تین چار مرتبہ باہر نکلتے تھے وہ بھی اندھیرے میں)۔

فرش پر چیتے کی کھال بچھا رکھی ہے۔ یہ چیتا بھی لازمی طور پر کسی بزرگ نے مارا ہوگا (لیکن پدرم صاحب نے کھال خریدنے سے پہلے یہ یقین کرا لیا ہوگا کہ کہیں بقیہ چیتا تو ساتھ نہیں لگا ہوا ہے) ویسے پدرم صاحب خود کوئی کام نہیں کرتے۔

رہبرِ عالم

پہلے سطحِ زمین کے اوپر کام کیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں (کافی ہاؤس کے) مباحثوں میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۹۳۲ء میں مختلف مقامات پر (ہوٹلوں میں) جوشیلی تقریریں کیں۔ پھر حالات کو ناسازگار پا کر دفعتاً زیرِ زمین چلے گئے۔ اگلے سال باہر نکلے۔ ۱۹۳۵ء میں پمفلٹ تقسیم کیے۔ ۱۹۴۰ء میں خفیہ پولیس کے افراد سے ملاقات۔ ۱۹۴۱ء سال بھر دوست احباب کی نظروں سے مفقود رہے۔ ۱۹۴۲ء پمفلٹ۔ ۱۹۴۳ء خفیہ پولیس۔ ۱۹۴۴ء پمفلٹ۔ ۱۹۴۵ء خفیہ پولیس۔

۱۹۴۶ء میں بمبئی کی ایک فلم کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ وہیں ہیں اور غالباً وہیں رہیں گے۔

ریحانہ خانم

سنہ پیدائش ایک راز ہے جو راز رہے گا۔ کانونٹ میں تعلیم پائی۔ بچپن میں ہیگل کے فلسفے سے متاثر ہوئیں۔ لڑکپن میں شوپنہار پسند رہا۔ پھر یک لخت کنفیوشس نے خیالات بدل ڈالے اور آپ نے میک اپ کرنا چھوڑ دیا (ایک ہفتے کے لئے)۔ عذرا پاؤنڈ کو خاتون سمجھ کر بڑے انہماک سے پڑھتی رہیں۔ جب پتہ چلا کہ یہ تو کوئی مردوا ہے تو فوراً چھوڑ دیا۔ یونیورسٹی کی ایک تقریب میں مقالہ "برطانوی فلسفیوں کا نظریہ موسم" پڑھا جو بے حد مقبول ہوا۔ پھر "جرمن قوم کا فوق البشر" لکھا۔ اس کے بعد گوئٹے اور کارلائل کا پہلے موازنہ کیا پھر مقابلہ۔ روسی مزاح پر مقالہ لکھنے کی کوشش کی لیکن ایک صفحے سے زیادہ نہ لکھ سکیں۔ ان دنوں عورت اور مرد کے حقوق پر بڑا شور مچا ہوا تھا۔ آپ اس تحریک میں شریک ہو گئیں۔ ۱۹۴۷ء میں بڑی شاندار تقریر کی جس پر (حلقۂ نسواں میں) بڑی واہ واہ ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کیسی بے انصافی ہے کہ اگر کوئی مرد احمقانہ حرکت کرے تو فقط یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مرد کتنا بے وقوف ہے۔ لیکن اگر کسی عورت سے ایسی حرکت سرزد ہو تو مرد کہتے ہیں کہ سب عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مرد اکثر جھوٹے دعوے کرتے

ہیں۔ مرد کہتا ہے کہ اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں مرجاؤں گا۔ چنانچہ وہ ستر برس کا ہو کر مرجاتا ہے بعض اوقات مرد شادی نہ ہوسکنے کی صورت میں خودکشی کی دھمکی دیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر بزدل زندہ رہتے ہیں۔

۱۹۴۲ء میں آپ نے کئی لیکچر دیے (اپنی سہیلیوں کو) دھواں دھار تقریریں کیں (گھر میں) اور عورتوں کے حقوق کی سب سے بڑی علمبردار بن گئیں۔

۱۹۳۶ء میں آپ نے فیصلہ کیا تھا کہ پچیس سال سے پہلے شادی نہیں کریں گی۔ لیکن ۱۹۴۲ء میں طے ہوا کہ جب تک شادی نہ ہو پچیس سال کی رہیں گی۔ اسی سال ایک عجیب حادثہ ہوا۔ ایک مرتبہ جب وہ حسین معلوم ہو رہی تھیں تو کسی سہیلی نے جل کر کہا۔ "حسن دیرپا نہیں ہوتا۔ افسوس کہ آج سے بیس سال بعد تمھاری عمر میں پانچ برس کا اضافہ ہو جائے گا۔"

آپ کو اتنا غصہ آیا کہ اگلے مہینے شادی کر ڈالی۔

۱۹۴۳ء میں آپ کا وزن ایک من بیس سیر تھا۔

۱۹۴۴ء میں مشہور مضمون "چھوٹے بچوں کا (ہر وقت) دانت نکالنا" چھپا۔ جو بڑی دلچسپی سے پڑھا گیا۔

۱۹۴۵ء میں وزن ڈیڑھ من۔ ایک بصیرت افروز مقالہ "بھوت پریت سے بچوں کو محفوظ رکھنا"

۱۹۴۶ء میں وزن پونے دو من۔ جامع مضمون "بچوں سے بھوت پریت کو محفوظ رکھنا"

ان دنوں ریسرچ کر رہی ہیں کہ بچوں کو زدوکوب کر کے سدھارنا بہتر ہے یا مار کھاتی ہے۔

اس وقت خیر سے چھ بچے ہیں (ساتواں نمبر خاوند کا ہے)۔

موسیقی سے شغف رکھتی ہیں۔ دو سازوں پر تو خاص عبور حاصل ہے۔ گراموفون اور ریڈیو۔

آج کل آپ کا وزن دو من پختہ ہے۔

ش۔ م۔ میر

پہلے اچھے بھلے تھے۔ یکایک زندگی کسی شدید حادثے سے دوچار ہوئی اور آپ نقاد بن گئے۔

پچھلے پندرہ بیس برس سے نقاد ہیں۔

۱۹۳۰ء میں ایک مقالہ لکھا جس سے ثابت کر دیا کہ تیمور لنگ لنگڑے نہیں تھے، فقط انھیں عذرِ لنگ پیش کرنے کی عادت تھی۔ تبھی نام پڑ گیا۔

۱۹۳۵ء میں آپ نے دنیا کو بتایا کہ پاٹلی پترا پنجابی لفظ ہے۔ اس لئے یا تو یہ شہر پنجاب میں آباد تھا اور یا پنجاب اس شہر تک پھیلا ہوا تھا۔ اس شہر کو پاٹلی صاحب کے پترا (یعنی لڑکے) نے آباد کیا۔ ہو سکتا ہے پاٹلی پارسی نام ہو (پاٹلی والا)۔

۱۹۳۶ء میں یہ راز افشا کیا کہ غالب کی شاعری پر رنگین کا اثر غالب ہے۔ رنگین نے بیشتر موضوع مصحفی سے اخذ کئے، مصحفی کی شاعری کا ماخذ میر کا تخیل ہے جنھوں نے بہت کچھ سراج دکنی سے لیا اور سراج دکنی نے ولی دکنی سے۔ ولی نے سب کچھ دکن سے چرایا۔

۱۹۳۷ء میں یہ انکشاف کیا کہ شیر افگن نے غالباً شیر نہیں مارے تھے فقط دیکھے تھے۔ ان دنوں بنگال میں شیر بکثرت پائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ انسان سے زیادہ شیر آباد تھے۔ "شیر افگن" کی ترکیب بالکل ویسی ہی ہے جیسے "جلوہ افگن"۔

۱۹۳۹ء میں آپ نے اس امر پر اظہارِ حیرت فرمایا کہ سارے مذہب محض ایشیا ہی کی پیداوار کیوں ہیں؟ افریقہ، یورپ، آسٹریلیا اور امریکہ میں کبھی کوئی پیغمبر پیدا نہیں ہوا۔

۱۹۴۰ء میں آپ نے انقلاب فرانس کی اصل وجہ دریافت کی کہ لوئی شانزدہم کے عہد میں لوگ لوئیوں کی تعداد سے بالکل تنگ آچکے تھے چار پانچ لوئی ہوتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن اکٹھے سولہ لوئی۔ یہ سراسر زیادتی تھی۔ اگر فرانسیسی اس کا فوری انسداد نہ کرتے تو اب تک کم از کم ڈیڑھ سو لوئی ہوتا۔

آپ بڑے سنجیدہ مفکر ہیں۔ ہمیشہ سوچتے رہتے ہیں۔ مسکرانے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں چہرے پر شگاف نہ آجائے۔ دھوپ میں بیٹھنے کا بڑا شوق ہے چنانچہ سر کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے ہیں۔ سنا ہے کہ آپ نے کریلے کی بیل نیم پر چڑھائی ہے۔ ان خاص کریلوں کو بڑی رغبت سے نوش فرماتے ہیں۔

بڑے مشکل پسند ہیں۔ 'ہاں'، بہت کم کہتے ہیں ہر بات پر انکار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی

تصویر مانگے تو نگیٹیو ملے گا وہ بھی بڑی حجت کے بعد۔

آپ مقالے لکھتے رہیں گے۔ پھر ایک دن آپ کو کوئی اعزازی ڈگری مل جائے گی۔

صحیح رقم خوشنویس

پہلے کچھ اور کیا کرتے تھے۔ ایک دن جھنجلا کر کاتب بن گئے۔ ان کی لکھی ہوئی عبارت پر پروئے ہوئے موتیوں کا دھوکہ ہوتا ہے۔ زبان کے پکے ہیں۔ جب وعدہ کر لیتے ہیں تو اسی سال کام مکمل کر کے رہتے ہیں۔

لکھتے وقت الفاظ میں موقع (اور اپنے موڈ) کے مطابق ترمیم بھی کرتے جاتے ہیں۔ عالم دلسوزی کو عالم ڈھوزی اور وادیٔ نیل کو وادیٔ بیل بنا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ کسی غلام حسن کے نواسے نے اپنے آپ کو نبیرۂ غلام حسن لکھ دیا جو آپ کو نامانوس سا معلوم ہوا۔ چنانچہ آپ نے کچھ دیر سوچ کر اسے بٹیرۂ غلام حسن تحریر فرمایا۔ ایک رومانی افسانے میں حور شمائل نازنین کی جگہ چور شمائل نازنین لکھ کر افسانے کو چار چاند لگا دیئے۔ اسی طرح قہقہے کو قمقمے۔ اپنا حصہ کو اپنا حقہ، پھلواری کو پٹواری بنا دیتے ہیں۔ پروازِ تخیل کی انتہا ہے کہ جہاں شبلی عفی عنہ لکھنا چاہیئے تھا وہاں آپ نے دستی دو عدد لکھا۔

اس وقت ملک میں آپ سے بہتر کاتب ملنا محال ہے۔

کلیم اختر

آپ کا جنرل نالج بے حد وسیع ہے (محلے کا) کوئی اہم واقعہ ایسا نہیں جو انھیں معلوم نہ ہو۔ (شہر کی) کوئی دلچسپ بات ان سے پوشیدہ نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جمعرات کی شام کو چودھری صاحب کے ساتھ کون تھا۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ پندرہ نمبر میں پیلی موٹر بار بار کیوں آتی ہے۔ پڑوسیوں کے یہاں شور مچنا کیوں بند ہو گیا ہے۔ شیخ صاحب کی ترقی کیوں رکی ہوئی ہے۔ شرما صاحب ان دنوں کیوں مسرور رہتے ہیں۔ سید صاحب کے استعفیٰ دینے کی اصل وجہ کیا ہے۔

کسی نے آپ کی افواہ پروری پر اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ تو قومی مشغلہ ہے ——— ہیں کیا، سب کے سب افواہوں کے دیوانے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت فلمی رسالے ہیں جو اتنی کثیر

تعداد میں بیچتے اور پڑھے جاتے ہیں۔

سنہ ۶۰ء میں آپ نے (محلہ میں) یہ انکشاف کیا خان صاحب کا کنبہ بڑا دلچسپ ہے۔ خان صاحب کا پرانا نام فریڈ فنتوبل اور آپ کے سالے کا نام رابرٹ گھسیٹامل تھا۔ پھر دونوں علی الترتیب فتح سنگھ اور غوث سنگھ بن گئے۔ فتح سنگھ نے مارگریٹ انتر کھی سے شادی کی۔ جب یہ فتح خان بنے تو وہ مارگریٹ جہاں بن گئیں — وغیرہ وغیرہ۔ اس خبر پر سب خوش ہوئے (سوائے متعلقہ کنبہ کے)۔

سنہ ۴۲ء میں آپ نے (شہر میں) بیان دیا کہ الحاج اللہ دتہ صاحب نے دراصل حج نہیں کیا۔ بمبئی تک حج کرنے والوں کے ساتھ گئے۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کر کے حاجیوں کے ساتھ لوٹ آئے۔ اللہ دتہ صاحب ہوائی جہاز کے سفر سے ڈرتے ہیں کہ حادثے کی صورت میں فوراً انتقال ہو جاتا ہے اور سمندر میں طوفان آتا ہے۔ وہیل اور شارک مچھلیوں کا ہر دم خطرہ رہتا ہے۔ اس خبر سے بھی سب خوش ہوئے (سوائے الحاج اللہ دتہ کے)۔

آپ کی زبان بڑی تیز ہے۔ اکثر دانتوں سے زبان کٹ جاتی ہے اور زبان سے دانت

آپ کی چستی کی یہ انتہا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے پولیس کے دو سپاہیوں کو گرفتار کرا دیا تھا۔

مشہور ہے کہ سوتے وقت بھی آپ کی ایک آنکھ کھلی رہتی ہے۔

مادھولال رفیق

دس برس تک ایکسٹرا رہے۔ پانچ برس ولین۔ ان دنوں اسسٹنٹ ہیرو ہیں۔

چونکہ آپ اداکاری کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہیں اس لئے آج تک ہیرو نہ بن سکے۔ لیکن ہمارے یہاں ہیرو اور ہیروئن بننے کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ پچاس برس کی ہیروئن اور پچپن برس کے ہیرو اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ لہذا ابھی مایوس نہیں ہوئے۔

آپ کو مصنوعی بال مصنوعی داڑھی، مونچھ اور دیگر مصنوعی چیزوں سے سخت نفرت ہے۔

سنہ ۴۶ء میں جب اصلی ہیرو قمار خانے میں پکڑا گیا تو انھیں ہیرو بننے کو کہا گیا۔ ہیرو کی لمبی لمبی مونچھیں ہونی چاہئیں تھیں۔ چنانچہ آپ نے تین ہفتے کی مہلت مانگی تاکہ مناسب سائز کی مونچھیں اگ آئیں۔ ڈائرکٹر نے کہا کہ تین ہفتے میں تو اصلی ہیرو جیل خانے سے واپس آجائے گا۔ پارٹ کسی اور کو

مل گیا۔

اسی طرح جب ۳۶ء میں اصلی ہیرو چوری کے سلسلے میں گرفتار ہوا تو انھیں دوبارہ موقع دیا گیا۔ ہیرو کے بال لمبے ہوا کرتے ہیں اور قلمیں نیچی۔ آپ نے نقلی بال لگانے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ فلم کی کہانی ابھی تک مکمل نہیں ہوئی تھی لیکن پروڈیوسر صاحب ایک مشہور گانے والی سے پلے بیک گانے ریکارڈ کرا چکے تھے اور انھیں پبلک کو نئی دھنیں دینے کی جلدی تھی وہ انتظار نہ کر سکے اور پارٹ ایک اور ایکٹر کو ملا جس کی مونچھیں نوکدار تھیں، سر کے بال کندھوں تک آتے تھے اور چہرے پر وہ انہماک تھا جو کھوئی ہوئی گائے کے منہ پر ہوتا ہے۔ آپ رول میں جان ڈال دیتے ہیں۔ پارٹ کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ ایکٹنگ کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ لڑائی کی سین میں جوش آگیا اور سچ مچ ایک ایکٹر کے سر میں ڈنڈا دے مارا۔ اس نے دعویٰ کر دیا اور آپ کو حوالات جانا پڑا۔ پھر ایک دفعہ چور کا رول ادا کرتے ہوئے ایک اونچی دیوار سے خوامخواہ چھلانگ لگا دی اور ٹانگ توڑ لی۔ کچھ عرصہ ہسپتال میں گزارا۔ شرابیوں کا سین آئے تو پانی کی جگہ اصلی شراب پیتے ہیں۔ رونے کا سین ہو تو گلیسرین کے آنسو ٹپکانے کی جگہ خوب بھوں بھوں کر کے روتے ہیں۔ رول ادا کرتے وقت جو لباس سٹوڈیو میں پہنتے ہیں اکثر اسی کو پہنے ہوئے گھر چلے جاتے ہیں۔ پولیس کے سپاہی اور تماشائی یوں ہی پیچھے لگ جاتے ہیں۔

دراصل ہمارے ملک میں آرٹسٹ کی قدر نہیں ہے۔

ماسٹر رحمت بخش

غالباً ۱۸ء میں پیدا ہوئے (اگر ۱۷ء، ۱۹ء یا ۲۰ء میں پیدا ہوتے تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا) سنا ہے کہ بچپن میں ہر بات میں بلا کی تندی و تیزی دکھاتے۔ بزرگ سر ہلاتے اور آپ کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہتے کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر ضرور کچھ کرے گا۔ جوان ہو کر موٹر ڈرائیور بنے۔ ان دنوں بس ڈرائیور ہیں۔

آپ نے موٹر چلانے کے چند سنہری اصول وضع کیے تھے جن میں سے چند قارئین کے استفادے کیلئے درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ موٹر ہمیشہ سڑک کے بیچ میں چلاؤ۔ کیونکہ سائیکل والے اور پیدل حضرات سڑک کا درمیانی حصہ استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ کسی موٹر کو آگے مت نکلنے دو۔ اگر کوئی ہارن بجا بجا کر تنگ کرنے لگے تو ذرا دائیں طرف ہو کر کچے راستے کی دھول اس پر ڈالو۔ خود ہی پیچھے ہو جائے گا۔

۳۔ اگر کوئی موٹر آگے آگے جا رہی ہو تو اسے اپنی ذاتی توہین سمجھو اور آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ ایک دو راہگیر نیچے آجائیں گے یا موٹریں الٹ جائیں گی۔

۴۔ موڑتے وقت گاڑی کی رفتار کم از کم پچاس میل فی گھنٹہ ہونی چاہیے ورنہ موشن ٹوٹ جائے گا اور ناحق گیئر بدلنا پڑے گا۔

۵۔ رات کو سامنے سے گاڑی آرہی ہو تو اللہ کا نام لے کر اس پر پوری روشنی چھوڑ دو۔ یہ دوسرے ڈرائیور کا فرض ہے کہ اپنی گاڑی کسی طرح بچالے۔

۶۔ یاد رکھو کہ ہر حادثے میں موٹر ڈرائیور دیسی فلموں کے ہیرو کی طرح صاف بچ جاتا ہے۔ چنانچہ حادثہ کرنے سے پہلے کھڑکی کے راستے کود جانے کے لئے تیار رہو۔

۷۔ جب کوئی حادثہ کرو تو بتیاں بجھا کر پوری رفتار سے بھاگ نکلو تاکہ سپاہی کو گاڑی کا نمبر نہ معلوم ہو سکے۔

۸۔ موٹر میں ہارن اس لئے لگایا گیا ہے کہ اسے لگاتار استعمال کیا جائے۔ اگر سڑک پر چڑیا بھی بیٹھی ہو تو زور سے ہارن بجاؤ۔ مسافر اور راہگیر دونوں متاثر ہوں گے۔ جہاں "یہاں ہارن بجانا منع ہے" کا نوٹس نصب ہو وہاں انتقاماً شور مچاؤ۔

۹۔ موٹر چلاتے وقت ہاتھ سے اشارے کرنا سراسر بے وقوفی ہے۔ یہ معلوم کرنا کہ اب موٹر کس طرف مڑے گی دوسروں کا فرض ہے۔ چنانچہ اگر ڈرائیور داہنا بازو باہر نکالے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ:

وہ اپنا تھکا ہوا بازو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔

وہ دائیں طرف مڑنا چاہتا ہے۔

وہ بائیں طرف مڑے گا۔

وہ کسی طرف بھی نہیں مڑے گا۔

وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ باہر بارش ہو رہی ہے یا نہیں۔

دوستی دوست کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا ہے۔

موٹر ابھی رکے گی۔ وغیرہ - وغیرہ۔

سنہ ۳۹ء میں آپ کا سکور یہ تھا:۔

چار راس بیل - ایک سائیکل (سائیکل والا فرار ہو گیا) تین کتے۔ چار راہگیر (معمولی ضربات) ایک پل کا کچھ حصہ۔

سنہ ۴۰ء - تین بکریاں۔ پانچ راہگیر (جنھیں فوراً ہسپتال پہنچایا گیا)۔ دو "آہستہ چلاؤ" کے بورڈ۔ ایک لاری کا عقبی حصہ۔ ایک اونٹ (ٹانگ زخمی ہوئی)۔ ایک "ہسپتال ہے شور نہ کیجئے گا" کا تختہ۔

سنہ ۴۱ء - دو بیل گاڑیاں (مع بیلوں اور سوتے ہوئے گاڑی بانوں کے)۔ ایک موٹر سائیکل (مع سوار کے) ریل کا پھاٹک (جو بند تھا)۔ دو گیدڑ (جو موٹر کی تیز روشنی کو بغور دیکھ رہے تھے)۔ چوراہے میں کھڑا ہوا سپاہی (جس نے آپ کو روکنے کی کوشش کی تھی)۔

آپ کو فخر ہے کہ ہر سال آپ کا سکور پچھلے سال سے بہتر ہوتا ہے۔ جوانی میں آپ نے بیوک، شور لے دیگر قیمتی کاریں چلائی تھیں۔ چنانچہ لاریوں کو بھی آپ اسی پرانے انداز سے چلاتے ہیں۔ آپ نے موٹر چلانے کے جو اصول مرتب فرمائے تھے ان پر ملک بھر میں عمل کیا جاتا ہے۔

مسٹر منظور افضل

سنہ ۲۰ء میں میٹرک کیا۔ چونکہ میٹرک کر چکے تھے اس لئے بی۔ اے کرنا پڑا اور پھر ایم۔ اے ہونا پڑا۔ ایم۔ اے پاس کر چکے تھے اس لئے نوکری کرنی پڑی۔ چونکہ نوکری مل گئی تھی اس لئے شادی بھی ضروری تھی۔ سنہ ۲۲ء میں آپ پچیس برس کے تھے۔ آپ نے حساب لگایا کہ اگر اگلے تین برس میں دو لڑکوں اور ایک لڑکی کے باپ بن گئے تو سنہ ۵۵ء تک (جب آپ پچپن برس کے ہوں گے) لڑکی کی شادی ہو چکی ہوگی اور لڑکے تعلیم سے فارغ ہو چکے ہوں گے۔ آپ نے فوراً شادی کر لی۔

سنہ ۲۳ء تک کوئی اولاد نہ ہوئی تو آپ گھبرائے۔ اگرچہ اولاد کے لئے کوئی خاص جائیداد نہ تھی تاہم خاندان کے نام کا سوال تھا اور پھر حساب لگایا جا چکا تھا۔

سنہ ۲۴ء میں دوسری شادی کی۔ سنہ ۴۲ء میں یہ پوزیشن تھی:۔

۲۔ کسی موٹر کو آگے مت نکلنے دو۔ اگر کوئی ہارن بجا بجا کر تنگ کرنے لگے تو ذرا دائیں طرف ہو کر کچے راستے کی دھول اس پر ڈالو۔ خود ہی پیچھے ہو جائے گا۔

۳۔ اگر کوئی موٹر آگے آگے جا رہی ہو تو اسے اپنی ذاتی توہین سمجھو اور آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ ایک دو راہگیر نیچے آجائیں گے یا موٹریں الٹ جائیں گی۔

۴۔ موڑتے وقت گاڑی کی رفتار کم از کم پچاس میل فی گھنٹہ ہونی چاہیے ورنہ موشن ٹوٹ جائے گا اور ناحق گیئر بدلنا پڑے گا۔

۵۔ رات کو سامنے سے گاڑی آرہی ہو تو اللہ کا نام لے کر اس پر پوری روشنی چھوڑ دو۔ یہ دوسرے ڈرائیور کا فرض ہے کہ اپنی گاڑی کسی طرح بچالے۔

۶۔ یاد رکھو کہ ہر حادثے میں موٹر ڈرائیور دیسی فلموں کے ہیرو کی طرح صاف بچ جاتا ہے۔ چنانچہ حادثہ کرنے سے پہلے کھڑکی کے راستے کود جانے کے لئے تیار رہو۔

۷۔ جب کوئی حادثہ کرو تو بتیاں بجھا کر پوری رفتار سے بھاگ نکلو تاکہ سپاہی کو گاڑی کا نمبر نہ معلوم ہو سکے۔

۸۔ موٹر میں ہارن اس لئے لگایا گیا ہے کہ اسے لگاتار استعمال کیا جائے۔ اگر سڑک پر چڑیا بھی بیٹھی ہو تو زور سے ہارن بجاؤ۔ مسافر اور راہ گیر دونوں متاثر ہوں گے۔ جہاں "یہاں ہارن بجانا منع ہے" کا نوٹس نصب ہو وہاں انتقاماً شور مچاؤ۔

۹۔ موٹر چلاتے وقت ہاتھ سے اشارے کرنا سراسر بے وقوفی ہے۔ یہ معلوم کرنا کہ اب موٹر کس طرف مڑے گی دوسروں کا فرض ہے۔ چنانچہ اگر ڈرائیور داہنا بازو باہر نکالے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ:

وہ اپنا تھکا ہوا بازو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔

وہ دائیں طرف مڑنا چاہتا ہے۔

وہ بائیں طرف مڑے گا۔

وہ کسی طرف بھی نہیں مڑے گا۔

وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ باہر بارش ہو رہی ہے یا نہیں۔

دوسری بیوی سے .... چار بچے

پہلی بیوی سے .... ایک بچہ

[illegible] .... دو [illegible]

بڑے چوکس چوکنے اور چست انسان ہیں۔ خیالات سے زیادہ عمل پر یقین رکھتے ہیں۔ ہر وقت قائل بہ عمل رہتے ہیں۔ جب تک خود نہ دیکھ لیں کسی چیز پر یقین نہیں کرتے۔ چونکہ خداوند تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے اس لیے کبھی کبھی دہریے بن جاتے ہیں۔ بعد حساب لگا کر ایمان لے آتے ہیں۔

ہر کام فارمولوں کے مطابق کرتے ہیں۔ مثلاً اگر پچاس مہمانوں کی دعوت کرنا ہو تو پہلے کہیں سے پچاس آدمی اکٹھے کر کے گھر میں ادھر ادھر بٹھا کر ریہرسل کرتے ہیں۔ جو اکثر ناکامیاب رہتی ہے۔ چنانچہ کبھی کسی کو مدعو نہیں کرتے لیکن دوسرے تیسرے سال جب دعوت کرتے ہیں تو بڑے اہتمام کے ساتھ ایسے موقعوں پر روپیہ گوند کی طرح بہاتے ہیں۔

آپ کو طرح طرح کے شوق رہ چکے ہیں۔ سال بھر تک شاعری کی۔ مجموعہ کلام مرتب فرمایا۔ اگلے سال جو غور سے دوبارہ پڑھا تو یونہی سا معلوم ہوا۔ چنانچہ آپ نے چھپوانے کا ارادہ ترک کر دیا (کاش کہ دوسرے بھی اسی طرح کیا کریں)۔

پھر نثر کی جانب ملتفت ہوئے۔ افسانوں کے دو مجموعے مرتب فرمائے۔ ایک سال انتظار کیا۔ دوبارہ جو پڑھا تو فوراً مسودہ تلف کر دیا۔

فوج میں بھرتی ہونے کا شوق ہوا تو کسی سے وردی مانگ لائے۔ پہن کر آئینے کے سامنے کچھ دیر کھڑے رہے اور ارادہ بدل دیا۔

پولیس میں شامل ہونے سے پہلے چاند ماری کی مشق کی۔ اگر چاند کھلا ہوا ہوتا تو ضرور اسے گولی لگ جاتی (کیونکہ گولیاں ہر سمت میں جا رہی تھیں)۔

[illegible] میں ٹھیکیداری شروع کی۔

[illegible] میں ادھر ادھر سے چیزیں بہم پہنچا کر آپ رفاہِ عام کے لیے ایک مسجد تعمیر کر رہے تھے کہ کسی نے [illegible] دی کہ یہ شخص سرکاری خرچ پر بہشت جانا چاہتا ہے۔ [illegible] میں مقدمہ چلا

آپ صاف بری ہو گئے۔ (کیونکہ آپ کا وکیل بڑا ہوشیار تھا)

سنہ ۵۰ء میں ٹھیکیداری شروع کر دی۔

آپ کا قول ہے کہ دنیا میں ترقی کرنے کے دو طریقے ہیں۔ اپنی محنت اور قابلیت سے ـــــ یا دوسروں کی بیوقوفی سے۔ آپ آخر الذکر طریق کے قائل ہیں۔

منظم ایچ خاں

سنہ ۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۳۶ء میں جوان ہوئے۔ جوان ہوتے ہی علم و ادب پر جان چھڑکنے لگے۔ سنہ ۳۸ء تک جان چھڑکتے رہے۔ سنہ ۳۹ء ادب آگے نکل گیا۔ سنہ ۴۰ء جان چھڑکنا منسوخ کر دیا۔ سنہ ۴۱ء باقاعدہ جوان ہوئے۔ تنظیم میں حصہ لینے لگے۔ سنہ ۴۲ء انجمن تحفظ گوجراں کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ سنہ ۴۳ء میں جماعت تربیتِ طفلاں کے خزانچی۔ سنہ ۴۴ء کبڈی لیگ کے ایڈیشنل نائب صدر۔ سنہ ۴۵ء جماعت پرورشِ مویشیاں کے سب اسسٹنٹ سکریٹری۔

زندگی کا مقصد کارڈ چھپوا کر تقسیم کرنا۔ ہر دو ہفتے کے بعد ایک جلسہ منعقد کرنا۔ پچھلے جلسے کی روئداد پڑھنا۔ تقریروں کے دوران میں اور اختتام پر تالیاں بجانا۔

منشی اعجاز حسین محتسب

پچھلی صدی میں پیدا ہوئے۔ اوائلِ عمر خصوصاً جوانی میں بڑا اتقا رہا۔ کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش [illegible] آیا۔ پھر بوڑھے ہو گئے۔

بڑے شریف النفس ہیں۔ باہر نکلتے ہیں تو ہمیشہ نظریں نیچی کر کے چلتے ہیں۔ اکثر لوگوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ کئی مرتبہ موٹر کے نیچے آتے آتے بچے۔

بڑے صاف گو ہیں۔ کوئی ملنے جائے تو پوچھتے ہیں کیا کام ہے؟

ایک مرتبہ ایک ترقی پسند شعر سن کر بولے "لاحول ولا قوۃ الا باللہ [illegible] سبحان اللہ"

نوجوانوں کو نصیحتیں کرتے رہتے ہیں۔ جو حرکتیں جوانی میں خود کی تھیں [illegible] کسی نوجوان کو کرتے دیکھ پائیں تو بہت خفا ہوتے ہیں اور اسے برا بھلا کہتے ہیں۔

سیر و سیاحت کے دلدادہ ہیں۔ سنہ ۱۱ء سفر لاہور (منشی فاضل کا امتحان)۔ سنہ ۱۵ء سفر گوجرانوالہ (مالٹے خریدنے)۔ سنہ ۲۰ء سیاحتِ منٹگمری (سرخ مالٹوں کی خرید۔ پہلے ملے اچھے نہیں تھے)۔ سنہ ۳۵ء سے سنہ ۳۰ء تک سیالکوٹ اور گرد و نواح (الکشن کا سلسلہ)۔ سنہ ۳۷ء وزیر آباد (عدالت کی پیشی)۔

وضعداری کے پابند ہیں۔ کوئی بلائے تو دیر سے پہنچتے ہیں۔ اکثر آتے ہی نہیں۔ بہت سے لوگ تقریبوں میں انھیں اس امید پہ بھی مدعو کر لیتے ہیں کہ شاید یہ آئیں ہی نہ۔

آپ کو فخر ہے کہ دنیا بھر میں آپ کا ایک بھی دشمن نہیں ہے (غالباً اس طویل عرصے میں سب مر کھپ چکے ہوں گے۔)

معذرت:۔ جگہ کی قلت کی وجہ سے جن ہستیوں کا ذکر یہاں نہ کیا جا سکا، ان سے التماس ہے کہ وہ اپنے حالات زندگی براہِ راست ناشرین کو بھیج دیں۔ انھیں اگلے شمارے میں شامل کر لیا جائے گا۔

داہی

انٹرویو

[پبلک سروس کمیشن کی ملازمت کے لئے]

"آپ کی تعلیم؟" "بی اے پاس ہوں عالی جناب!" "کمبی نیشن؟" "ہسٹری اردو ادب، علم الحساب"

"ہسٹری؟" "اچھا تو یہ کہیئے اشوکا کون تھا؟" "پاٹلی پترا کے شاہنشاہ، اکبر کا چچا!"

"اور یہ فرمایئے وکٹوریہ کس کا ہے نام؟" "پالکی گاڑی سواری کے لئے جیسے ٹرام!"

"کون الجبرا کا موجد ہے بتائیں تو ذرا؟" "موجد اس کا الجزائر میں کوئی ڈیگال تھا!"

"اور اقلیدس اُپج ہے کس ستم ایجاد کی؟" "وہ تو اک تخلیق بے تمثیل ہے فرہاد کی؟"

"یہ تو کہیئے چیانگ کائی شیک کس کا نام ہے؟" "فارسی میں شیخ سعدی کا وہ عرفِ عام ہے"

"میرزا غالب کے بارے میں بھی ہیں کچھ جانتے؟" "کیوں نہیں؟ ہم شاعرِ اعظم ہیں ان کو مانتے"

"ذوق کے شاگرد ہیں ہمعصرِ میر و شاد ہیں شاہنامے کے مصنف ہیں، جگت اُستاد ہیں"

"خوب! کوئی شعر ان کا یاد تو ہوگا ضرور؟" "ایک کیا؟ سنیئے پچاسوں شعر پڑھتا ہوں حضور!

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے شمع یہ سودائی دل سوزئ پروانہ ہے"

"شکریہ! حاضر جوابی آپ کی ہے بے عدیل
آپ آگے چل کے بن سکتے ہیں جنتا کے وکیل"

SHAHKAR
ALLAHABAD-1

Regd. No. L 2005



ہندوستان کو اپنے طالب علموں پر بڑا فخر ہے۔ وہ جانتے ہیں مُلک ایک آزمائش سے گزُر رہا ہے۔ اِس آزمائش میں جو فرض ان پر واجب ہے، اُسے ادا کرنے میں وُہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ نیشنل کیڈیٹ کور میں بھرتی ہو کر، اپنا خوُن دیکر، شہری بچاؤ کے کام میں ہاتھ بٹا کر اور چندہ اکٹھا کر کے وہ بڑا کام کر رہے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی پڑھائی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں پڑھائی پوُری کر کے وہ مُلک کے اور زیادہ کام آسکیں گے۔ ہمارے طالب علم مُلک کی خدمت میں جُٹے ہوئے ہیں۔

سوچیں تو! آپ مُلک کے لئے کیا کر رہے ہیں؟

ایک عظیم مُلک ہمارا
ایک عظیم قوم

DA 65/F11